تدبّرِ قرآن

۵۱

الذّٰریٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ ـــ قٓ ـــ کی مثنیٰ ہے۔ سورۂ قٓ کی تفسیر میں آپ نے دیکھا کہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو قرآن کے اس دعوے کو بعید از امکان قرار دیتے تھے کہ لوگ مرنے کے بعد از سر نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ اس سورہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر قرآن کے انذارِ عذاب کو بھی ثابت کیا گیا ہے اور جزاء و سزا کو بھی۔ سورہ کا عمود اس کی تمہید ہی میں ان الفاظ سے واضح فرما دیا گیا ہے "اِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ہ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ" (بے شک جو وعید تم کو سنائی جا رہی ہے وہ بالکل سچی ہے اور جزاء و سزا لازماً واقع ہو کے رہے گی)۔

خطاب قریش کے مکذبین ہی سے ہے اور استدلال کی بنیاد تمام تر آفاق و انفس کے دلائل پر ہے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورہ میں بھی اسی طرح تسلی دی گئی ہے جس طرح سابق سورہ میں دی گئی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۴) ہواؤں کے عجائب تصرفات اور برسا کے دھاریوں والے بادلوں کے حوالہ سے ان غفلت کے ماتوں کو انذار جو قرآن کی وعیدِ عذاب اور اس کے وعدۂ جزاء و سزا کا مذاق اڑاتے اور بانداز استہزار مطالبہ کر رہے تھے کہ جس جزاء و سزا کے دن سے ڈرایا جا رہا ہے وہ کہاں ہے، اس کو لا یا کیوں نہیں جاتا! ان لوگوں کو تنبیہ کہ پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے وہ بھی ایک حقیقت ہے اور جس روزِ جزاء و سزا سے آگاہ کیا جا رہا ہے وہ بھی ایک امر واقعی ہے۔ ان میں شک وہی لوگ کر رہے ہیں جن کی عقلیں الٹ گئی ہیں۔ اس دن کے لیے جلدی مچانے والے عنقریب اس کا مزا چکھیں گے۔ اس دن ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ دن جس کے لیے تم جلدی مچاتے ہوتے تھے!

(۱۵-۱۹) ان خدا ترسوں کے صلہ کا بیان جو غفلت کی سرمستیوں میں کھوئے رہنے کے بجائے نماز، استغفار اور انفاق کے ذریعہ سے اس دن کے لیے برابر تیاریوں میں سرگرم رہے۔

(۲۰-۲۳) جزاء و سزا کی جو نشانیاں زمین و آسمان اور آفاق و انفس ہیں موجود ہیں ان کی طرف اشارہ اور آخر میں اصل دعوے کا بتاکیدِ قسم اعادہ کہ جس طرح لوگوں کے لیے ایک لفظ کا بول دینا نہایت آسان ہے

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے اس دنیا کو اس کے فنا ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ کر دینا نہایت آسان ہے۔

(۲۴-۳۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام اور قومِ لُوط کے واقعہ کی طرف اشارہ کہ جو فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ایک ذی علم فرزند کی بشارت لے کر آئے وہی فرشتے قومِ لوط کے لیے عذاب کا تازیانہ لے کر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو فنا کر دیا جنھوں نے حضرت لوط کی تکذیب کی اور ان لوگوں کو نجات بخشی جو ان پر ایمان لائے۔ یہ اس بات کی تاریخی شہادت ہے کہ اس کائنات کا خالق جزا اور سزا دینے والا ہے اور اس کے اس قانونِ مکافات کی ایک نشانی قومِ لُوط کی سرزمین میں موجود ہے جس سے وہ لوگ عبرت حاصل کر سکتے ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

(۳۸-۴۶) فرعون، عاد، ثمود اور قومِ نوح کے واقعات کی طرف ایک اجمالی اشارہ کہ ان قوموں نے بھی مکافاتِ عمل کے قانون سے بے پروا ہو کر زندگی گزاری اور اپنے رسولوں کے انذار کی کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ قاہرہ سے سب کو تباہ کر دیا۔ اس کے لیے اس کو کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا بلکہ اس کی ہواؤں اور اس کے بادلوں نے ہی ان سب کا ستھراؤ کر کے رکھ دیا۔

(۴۷-۶۰) خاتمۂ سورہ جس میں پوری سورہ کا مضمون سمیٹ دیا گیا ہے کہ جو اللہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور جس نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے اس کے لیے دنیا کو از سرِ نو پیدا کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔ جزا و سزا شدنی ہے اور سب کی پیشی خدا ہی کے آگے ہونی ہے تو خدا ہی کی طرف بھاگو۔ اس کے سوا کسی اور سے لَو نہ لگاؤ۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے سب ہی کے ساتھ ان کی قوموں نے یہی سلوک کیا جو تمھاری قوم تمھارے ساتھ کر رہی ہے۔ تو ان سرکشوں کو ان کے حال پر چھوڑو۔ صرف ان لوگوں کو یاددہانی کرو جو یاددہانی سے فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ یہ اطمینان رکھو کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ نہ دوسروں کی رزق رسانی کی ذمہ داری ان پر ڈالی ہے اور نہ میں اس بات کا حاجتمند ہوں کہ لوگ مجھے کھلائیں۔ میں خود سب کا روزی رساں اور بڑی قوت و طاقت رکھنے والا ہوں۔ میرے جو بندے میری بندگی کا حق ادا کرنے کے لیے سب سے بے نیاز ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے ان کی کفالت اور نصرت کے لیے میں کافی ہوں۔ دوسرے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ رہے یہ ظالم لوگ تو اس دنیا میں سے ان کا جو حصہ مقدر ہے وہ پائیں گے۔ ان کے جلدی مچانے کے سبب سے اللہ تعالیٰ ان کو اس مہلت سے محروم نہیں کرے گا جو اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہے، لیکن بالآخر ان کو اسی دن سے سابقہ پیش آنا ہے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔

سُوۡرَۃُ الذّٰرِیٰتِ (۵۱)

مَکِّیَّۃٌ —— آیات: ۶۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آیات ۱-۱۴

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ﴿۲﴾ فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ﴿۳﴾ فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ۙ﴿۴﴾ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۶﴾ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡحُبُکِ ۙ﴿۷﴾ اِنَّکُمۡ لَفِیۡ قَوۡلٍ مُّخۡتَلِفٍ ۙ﴿۸﴾ یُّؤۡفَکُ عَنۡہُ مَنۡ اُفِکَ ؕ﴿۹﴾ قُتِلَ الۡخَرّٰصُوۡنَ ﴿ۙ۱۰﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ غَمۡرَۃٍ سَاہُوۡنَ ﴿ۙ۱۱﴾ یَسۡـَٔلُوۡنَ اَیَّانَ یَوۡمُ الدِّیۡنِ ؕ﴿۱۲﴾ یَوۡمَ ہُمۡ عَلَی النَّارِ یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۱۳﴾ ذُوۡقُوۡا فِتۡنَتَکُمۡ ؕ ہٰذَا الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۱۴﴾

ترجمہ آیات ۱-۱۴

شاہد ہیں تند ہوائیں جو اڑاتی ہیں غبار۔ پھر اٹھا لیتی ہیں بوجھ۔ پھر چلنے لگتی ہیں آہستہ۔ پھر الگ الگ کرتی ہیں معاملہ۔ کہ جس عذاب کی تم کو وعید سنائی جارہی ہے وہ سچ ہے اور جزاء وسزا بے شک واقع ہو کے رہے گی۔ شاہد ہے دھاریوں والا آسمان! بے شک تم ایک اختلاف میں پڑے ہوئے ہو۔ اس سے وہی رُوگردانی کرتے ہیں جن کی عقل الٹ دی گئی ہو۔ اٹکل کے تیر تکے

چلانے والے ہلاک ہوں! غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، بالکل بے خبر۔ پوچھتے ہیں جزاو سزا کا دن کب آئے گا! جس دن وہ آگ پر تپائے جائیں گے! چکھو مزا اپنے فتنہ کا، یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے! ۱-۱۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (۱-۴)

'و' قسم کے لیے ہے اور قسم شہادت کے لیے

'وَالذّٰرِيٰتِ' میں 'و' قسم کے لیے ہے اور اس بات کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں اس طرح اشیاء کی جو قسمیں کھائی گئی ہیں اس کا مقصود ان اشیاء کی تعظیم نہیں، بلکہ ان کو اس دعوے پر شہادت کے لیے پیش کرنا ہے جو قسم کے بعد مذکور ہوتا ہے یا سیاق کلام سے سمجھا جاتا ہے؛ چنانچہ یہ قسم بھی شہادت ہی کے لیے ہے۔ اس کا ترجمہ اگر شہادت کے لفظ سے کیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ یہ زیادہ معنی خیز ہوگا۔

'ذاریٰت'

'ذَارِيَاتٌ' غبار اڑانے والی ہواؤں کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہواؤں کی صفت کے طور پر آتا ہے۔ لیکن یہ اپنے موصوف کے لیے اس طرح معروف ہو چکا ہے کہ اس کے قائم مقام کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔ 'ذَارِيَاتٌ' کے بعد لفظ 'ذَرْوًا' کے اضافے سے معنی میں اسی طرح کا اضافہ ہو گیا ہے جس طرح 'ضَرَبَ ضَرْبًا' کے اندر تاکیدِ فعل کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اس طرح کی تاکیدات کا مفہوم اردو ترجمے میں منتقل کرنا بعض اوقات مشکل ہوتا ہے۔ یہاں اگر ہواؤں کے ساتھ 'تند' کا اضافہ کر دیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ یہ مفہوم ادا ہو جائے گا۔

'ف' کے ساتھ عطف کے فوائد

'فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا' جب صفات کا عطف 'ف' کے ساتھ ہو تو یہ دو باتوں پر دلیل ہوتا ہے۔ ایک اس بات پر کہ ان کے اندر ترتیب ہے، دوسری اس بات پر کہ یہ تمام صفتیں ایک ہی موصوف کی ہیں۔ عربیت کے اس قاعدے کی رو سے یہاں جو تین صفتیں 'ف' کے ساتھ بیان ہوئی ہیں وہ لازماً ہواؤں ہی کی ہوں گی۔ جن لوگوں نے ان کو الگ الگ چیزوں کی صفت مانا ہے ان کی رائے عربیت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے نظائر کے بھی۔

سورۂ عادیات میں ہے۔

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۱-۵)

گواہی دیتے ہیں وہ جو ہانپتے دوڑتے ہیں، پھر ٹھوکروں سے چنگاریاں نکالتے ہیں، پھر صبح کو دھاوا کرتے ہیں، پھر غبار اٹھاتے ہیں، پھر غول کے اندر گھس جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام صفتیں الگ الگ چیزوں کی نہیں ہیں، بلکہ گھوڑوں ہی کی ہیں اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے بیان میں ترتیب بھی ملحوظ ہے۔

کلامِ عرب میں بھی اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ ہم صرف ابن زیابہ کا ایک مشہور شعر نقل کرتے ہیں۔

يا لهف زيابة للحارث الصابح، فالغانم، فالآيب

(زیابہ کی طرف سے افسوس ہے حارث پر، جس نے غارت گری کی، لوٹا اور چل دیا)

'وقر'

'وِقْرٌ' کے معنی بوجھ اور بار کے ہیں۔ یوں تو اس سے ہر وہ بوجھ اور بار مراد ہو سکتا ہے جس کو ہوائیں اٹھاتی ہیں، مثلاً غبار اور کنکر وغیرہ لیکن اس کا معروف استعمال بادلوں کے لیے ہے۔ مثلاً

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ (الاعراف: ۵۷)

اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر اپنے بارانِ رحمت سے پہلے۔ یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں ہم ان کو ہانکتے ہیں کسی مردہ زمین کی طرف اور وہاں بارش برسا دیتے ہیں۔

'جاریات' کا مفہوم اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

'فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا' یہ صفت بھی ہواؤں ہی کی ہے۔ جن لوگوں نے اس سے کشتیاں مراد لی ہیں ان کی رائے اس قاعدے کے خلاف ہے جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے۔ 'یُسْرٌ' کے معنی آہستہ اور نرم کے ہیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے تند اور غبار انگیز ہوائیں چلتی ہیں جو مختلف سمتوں سے بادلوں کو ہانک ہانک کر لاتی اور جس علاقہ کو سیراب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے، اس پر ان کو تہ بہ تہ جما دیتی ہیں۔ پھر ہوا کی رفتار نرم ہو جاتی ہے اور مینہ برسنا شروع ہو جاتا ہے۔

'تقسیم امر' کا مفہوم

'فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا'۔ 'قَسَمَ الْاَمْرَ' کے معنی ہوں گے کہ جس کے لیے جو بات طے تھی یا جو امر مقدر تھا وہ اس کو پہنچا دیا۔ یعنی یہ ہوائیں بادلوں کو لاد کر لانے کے بعد اپنے رب کے حکم کے مطابق تقسیم امر کرتی ہیں۔ یعنی جس علاقہ کے لیے جتنا پانی برسانے کا حکم ہوتا ہے اتنا برسا دیتی ہیں۔ بعض کو جل تھل کر دیتی ہیں، بعض کو نیم تشنہ اور بعض کو خشک چھوڑ جاتی ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ ان کو حکم دے

دیتا ہے تو بعض علاقوں پر وہ طوفان و سیلاب بن کر نازل ہوتی ہیں اور پورے پورے علاقے کا علاقہ ان کی زد میں آکر تباہ ہو جاتا ہے۔ ہواؤں کے تصرفات، اور ان کے فرق و امتیاز کی نیرنگیاں نہایت حیرت انگیز ہیں۔ ایک قوم کے ساتھ ان کا معاملہ کچھ ہوتا ہے، دوسری قوم کے ساتھ کچھ۔ کسی قوم کے لیے یہ ابرِ رحمت کی بشارت بن کر ظاہر ہوتی ہیں، کسی قوم کے لیے طوفانِ عذاب بن کر۔ آگے، ان شاء اللہ، اس کی تفصیل آئے گی۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (۵-۶)

قسم کا مقسم علیہ

یہ اوپر کی قسم کا مُقسم علیہ ہے۔ یعنی ہواؤں کے یہ عجائب تصرفات، جن کا تم برابر مشاہدہ کرتے رہتے ہو، اس بات پر شاہد ہیں کہ جس چیز کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے وہ بالکل سچ ہے اور جزا و سزا لازماً واقع ہو کے رہے گی۔

'توعدون' کا مفہوم

'اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ': استاذ امام فراہیؒ کے نزدیک 'تُوْعَدُوْنَ'، 'وعد' سے ہے جس کے تحت وہ تمام چیزیں داخل ہیں جن کا نبیوں کی زبانی وعدہ کیا گیا ہے، یعنی حشر نشر، جزا سزا اور رحمت و نقمت وغیرہ۔ وہ 'اِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ' کو اسی پر عطف خاص علی العام کی حیثیت دیتے ہیں؛ لیکن میرا رجحان اس طرف ہے کہ 'تُوْعَدُوْنَ'، 'وعید' سے ہے اور یہاں اس سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً اس کے مکذبین پر نازل ہوتا ہے۔ گویا ہواؤں کے عجائب تصرفات کی قسم یہاں میرے نزدیک دو چیزوں پر کھائی گئی ہے۔ ایک اس بات پر کہ قریش کو جس عذاب کی بصورت تکذیب دھمکی دی جا رہی ہے اور جس کو وہ محض ایک دھونس گمان کر رہے ہیں وہ دھونس نہیں ہے بلکہ بالکل سچی دھمکی ہے اور اس طرح وہ جزا و سزا بھی ایک امر شدنی ہے جس کو وہ بہت بعید از امکان سمجھ رہے ہیں۔

میرے اس رجحان کے حق میں کئی باتیں جاتی ہیں، لیکن ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، صرف تین باتوں کی طرف اشارہ کافی ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ اس طرح مقسم علیہ کے دونوں اجزاء کا محل بالکل بے تکلف الگ الگ معین ہو جاتا ہے۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا۔ ایک اس عذاب سے جو اس دنیا میں ان پر نازل ہوا اگر وہ اپنی تکذیب پر اڑی رہ گئیں، دوسرے اس عذاب سے جس سے لازماً ان کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا اگر ان کا خاتمہ کفر ہی پر ہوا۔ ان دونوں عذابوں کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور ہم اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ یہ حقیقت مقتضی ہے کہ یہاں ان دونوں عذابوں کا ذکر ہو جب کہ قسم ان دونوں پر شاہد ہے۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی

تیسری یہ کہ آگے رسولوں کی تکذیب کرنے والی بعض قوموں کا حوالہ قرآن نے اسی وعید کی تصدیق کے طور پر دیا ہے۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ ان کی تباہی میں ہواؤں کے تصرفات، کو قرآن نے خاص طور پر نمایاں فرمایا ہے۔

زبان کا ایک نکتہ

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ عذاب، دنیا کی وعید کا ذکر تو فعل سے کیا ہے اور آخرت کی جزا و سزا کا ذکر اسم 'دین' سے کیا ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ اس دنیا میں قوموں پر جو عذاب آتا ہے وہ ایک امر حادث اور مشروط بشرائط و حالات ہوتا ہے۔ لیکن جزا و سزا کا قانون اس دنیا کی خلقت کی غایت اور اس کا لازمی نتیجہ ہے اس وجہ سے پہلے کو فعل سے تعبیر فرمایا اور دوسرے کو اسم سے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۷)

'ذات الحبک' کی تحقیق

'سَمَاءُ' سے آسمان کو بھی مراد لے سکتے ہیں اور بادلوں کو بھی۔ یہ دونوں معنوں کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن آسمان کو مراد لیں گے تو یہاں لازماً 'ذات الحبک' کی صفت کے ساتھ ہی مراد لیں گے۔ اس وجہ سے اصل تحقیق طلب چیز یہ صفت ہی ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر سورۂ ذاریات میں اس لفظ کی تحقیق کلام عرب کے شواہد کی روشنی میں بیان فرمائی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں یہاں درج کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"'حَبْكٌ' کے معنی باندھنے اور گرہ لگانے کے ہیں۔ یہیں سے یہ اس مضبوطی و استواری کے لیے استعمال ہوا جو کسی چیز کی بناوٹ میں پیدا کی جائے۔ اسی سے 'حَبَاكٌ' ہے جس کی جمع 'حُبُكٌ' آتی ہے۔ 'حُبُكٌ' ان دھاریوں، شکنوں اور لہروں کو کہتے ہیں جو کسی گف اور مضبوط بناوٹ کے کپڑے میں نمایاں کی گئی ہوں ...... فراء کی تحقیق یہ ہے کہ 'حُبُك' سے مراد وہ لہریں اور شکنیں ہیں جو ریت یا ساکن پانی میں، جب کہ اس پر ہوا چل گئی ہو، پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہیں سے یہ بادلوں کی تعریف میں استعمال ہونے لگا کیونکہ بادلوں کے ٹکڑے بھی آسمان میں تہ بہ تہ موجوں اور تو بر تو روئی کے گالوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ امرؤالقیس فلک بوس محلوں کی تعریف کرتے ہوئے، جن پر بادل چھائے ہوئے ہیں، کہتا ہے۔

مکللة حمراء ذات اسرة — لها حبك کانها من وصائل

(ان محلوں پر سرخ دھاریوں والے بادل چھائے ہوئے ہیں گویا کہ دھاریوں والی چادریں ہیں)
یہ موسم سرما کے بادلوں کی تعریف ہے اور یہ ان کے رنگ اور ان کی تہوں کی نہایت صحیح تصویر ہے......

جن لوگوں نے 'ذات الحبک' سے چرخ کوکب مراد لیا ہے، خواہ اس کی مضبوطی و استواری کے پہلو سے یا اس وجہ سے کہ اس میں تارے ٹکے ہوئے ہیں، ہمارے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔

"...... یہ لفظ دھاریوں، شکنوں، لہروں اور خطوط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔"

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحقیق کی روشنی میں یہ قسم سرما کے سرخ دھاریوں والے بادلوں کی ہے جو شمال کی بادِ تند کے ساتھ نمایاں ہوتے اور جن کو پچھلی معذّب قوموں کی تباہی میں، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، بڑا دخل رہا ہے۔ گویا ہواؤں کی قسم کے بعد یہ بادلوں کی قسم اسی قسم کی تکمیل ہے اس لیے کہ ہواؤں اور بادلوں میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ اس قسم کے اضافے سے ہواؤں کی ہلاکت انگیزی کے پہلو کی طرف خاص طور پر اشارہ مقصود ہے۔

اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ (۸)

مخالفین کو ملامت

قرینہ شاہد ہے کہ یہ ٹکڑا جوابِ قسم نہیں ہے بلکہ مخالفین کے رویہ پر ان کو ملامت ہے۔ جوابِ قسم اوپر گزر چکا ہے اور یہ دوسری قسم اوپر والی قسم ہی کی تکمیل ہے اس وجہ سے اس کے بعد جوابِ قسم کے اعادے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ مکذبین کو سرزنش کر دی گئی کہ تم لوگ ایک صریح قسم کے اختلاف اور تناقضِ فکر میں مبتلا ہو ورنہ ان شہادتوں کے ہوتے نہ وعیدِ عذاب کو جھٹلانے کی گنجائش ہے، نہ وعدۂ جزاء و سزا میں شک کرنے کی۔

قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ وضاحتِ قرینہ کی بنا پر جوابِ قسم حذف کر کے اس کی جگہ کوئی سرزنش وملامت کا جملہ رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ قٓ میں گزر چکی ہے۔

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ (قٓ ۱-۲)	یہ قٓ ہے۔ قرآن بزرگ و برتر کی قسم (یہ کلام الٰہی ہے) بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس ایک آگاہ کرنے والا انہی میں سے آیا تو کافروں نے کہا یہ تو عجیب بات ہے!

اس آیت میں دیکھیے جوابِ قسم مذکور نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ مخالفین کو ان کی صریح دھاندلی پر ملامت کر دی گئی ہے۔ یہی اسلوب سورۂ بروج میں بھی اختیار فرمایا گیا ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ؕ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ (البروج ۱-۴)	قسم ہے برجوں والے آسمان کی اور روزِ موعود کی اور موعود کیے ہوئے دن کی اور شاہد و مشہود کی! ناس ہوں آگ کی گھاٹی والے!

مخالفین کا تضادِ فکر

'قولِ مختلف' سے قیامت اور جزاء و سزا کے باب میں ان کے تضادِ فکر اور تضادِ قول کی طرف اشارہ ہے۔ مشرکین عرب کے بارے میں ہم جگہ جگہ یہ لکھ چکے ہیں کہ ان میں سب قیامت کے کھلے منکر ہی نہیں تھے بلکہ انکار کرنے والوں کے ساتھ ان کے اندر ایک گروہ مذبذبین کا بھی تھا جو صریح

طور پر انکار نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو ایک مستبعد بات سمجھتے تھے۔ اسی طرح ان کے اندر ایک بہت بڑا گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو قیامت کو بعید از امکان تو نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کا گمان یہ تھا کہ قیامت کے دن ان کا معاملہ ان کے خرکار وشفعار سے متعلق ہوگا، وہ اپنے پجاریوں کو اپنی شفاعت سے بچالیں گے۔ یہ لوگ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے لیے وہ تمام صفتیں تسلیم کرتے تھے جو اس کی بدیہی اور لازمی صفات ہیں اور جو جزا و سزا کو لازم کرتی ہیں دوسری طرف ان کے بدیہی نتائج ولوازم کے بارے میں یا تو مبتلائے شک تھے یا ان کا انکار کرتے تھے۔ ان کی اسی ذہنی الجھن کی طرف یہاں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ مقصود ان کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ قرآن ان کو جس بات سے آگاہ کر رہا ہے وہ تو اس کائنات کی ایک بدیہی حقیقت ہے بشرطیکہ یہ لوگ اپنے ذہن کو سیدھی راہ پر سوچنے دیں، اس میں غیر فطری اڑنگے نہ ڈالیں۔ پچھلی سورہ میں فَهُمْ فِیْٓ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ ہمارے نزدیک دونوں جگہ ایک ہی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے۔

یُؤْفَکُ عَنْهُ مَنْ اُفِکَ (۹)

یہ جملہ 'قول مختلف' کی صفت نہیں بلکہ ایک مستقل جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے ذہن کو تناقض سے پاک کر کے سوچیں تو جزا و سزا کا معاملہ بالکل بدیہی حقیقت ہے لیکن جن لوگوں کی عقل الٹ دی جاتی ہے وہ اس سے برگشتہ کر دیے جاتے ہیں۔ 'اِفْک' کے معنی الٹ دینے کے ہیں اور 'مافوک' اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عقل الٹ دی گئی ہو۔ یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف: ۵) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں بیان ہوئی ہے یعنی ان لوگوں نے اپنی عقل صحیح طور پر استعمال نہیں کی اس وجہ سے قانونِ الٰہی کے مطابق ان کی عقل الٹ دی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کو وہ چیز بھی نظر نہیں آرہی ہے جس کی شہادت اس کائنات کے ہر گوشے سے مل رہی ہے۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (۱۰-۱۱)

گمان کا سہارا لینے والوں کی تباہی

یہ جملہ بھی ملامت و سرزنش کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اٹکل کے تیر تکے چلانے والے لوگ ہیں۔ انھوں نے اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا ہے اس وجہ سے آفاق و انفس اور ارض و سما کی وہ تمام دلیلیں جن کی طرف قرآن ان کو توجہ دلا رہا ہے، ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔ بصیرت سے محروم ہونے کے باعث اب ان کا تمام اعتماد قیاس و گمان پر رہ گیا ہے۔ اسی قیاس و گمان کے بل پر وہ اس واضح سے واضح حق کو بھی جھٹلانے پر کمربستہ ہیں جو ان کی خواہشوں کے خلاف ہے حالانکہ گمان کسی درجے میں بھی ان کے لیے حق کا بدل نہیں بن سکے گا بلکہ ایک دن ان پر واضح ہو جائے گا

کہ حق کے انکار کے لیے انھوں نے وہم و گمان کا جو سہارا لیا یہی ان کی تباہی کا اصل سبب بنا۔

جو امور جتنے ہی اہم ہیں ان کے لیے اتنا ہی اہتمام ہے

'خرص' کے معنی اندازہ اور تخمینہ کرنے کے ہیں 'خرص النخل والکرم' کے معنی ہیں کھجور کے درخت یا انگور کی بیل کے پھلوں کا اندازہ کیا۔ 'خرص فی الحدیث' کے معنی ہوں گے کہ ایک امر پر غور کیے بغیر، اس کے بارے میں ایک اٹکل پچو بات اڑا دی۔

انسان کی زندگی سے متعلق جو امور جتنے ہی اہم اور دُور رس نتائج کے حامل ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اتنا ہی زیادہ اہتمام فرمایا ہے۔ اٹکل اور اندازوں پر وہی امور اس نے چھوڑے ہیں جن کی انجام کار کے پہلو سے کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ جن امور کی خاص اہمیت ہے، جو دُور رس نتائج کے حامل ہیں اور جن پر انسان کی صلاح و فلاح کا انحصار ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے قیاس و گمان پر نہیں چھوڑا ہے بلکہ ان میں ہر پہلو سے اس نے حجت تمام کر دی ہے تاکہ انسان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ ان امور میں اٹکل کے گھوڑے دوڑانا بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص اندھیری رات میں اللہ کی بخشی ہوئی روشنی کو گل اور اپنی آنکھیں بند کر کے محض اٹکل سے راستہ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

انسان کے لیے اس کی عاقبت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے کسی پہلو کو بھی مبہم نہیں چھوڑا ہے بلکہ ہر جہت سے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرما دی ہے تاکہ گمراہی کا اندیشہ نہ رہے۔ آسمان و زمین میں اس نے قدم قدم پر نشاناتِ راہ گاڑ دیے ہیں جو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ آنکھیں دے دی ہیں جو ان نشانات کو دیکھ سکتی ہیں اگر انسان آنکھیں کھلی رکھے۔ عقل بخشی ہے جو ان اشاروں کو سمجھتی ہے یا سمجھ سکتی ہے بشرطیکہ انسان اس سے صحیح طور پر فائدہ اٹھائے۔ علاوہ ازیں انسان کی فطرت میں وہ تمام داعیات و محرکات ودیعت فرما دیے ہیں جو صحیح سمت میں قدم بڑھانے، خطرات کا مقابلہ کرنے اور انسان کو برابر بیدار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ پھر مزید اور سب سے اعلیٰ و اشرف انتظام یہ فرمایا کہ اپنے نبیوں، رسولوں اور اپنی اتاری ہوئی کتابوں کے ذریعہ سے اچھی طرح واضح فرما دیا کہ زندگی کی صحیح شاہراہ کیا ہے اور اس راہ کے لیے کیا زاد و راحلہ مطلوب ہے۔

اتنے گوناگوں اہتمام کے بعد بھی اگر انسان ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے محض اپنی اٹکل سے اپنے لیے کوئی اور راہ ڈھونڈنے کے درپے ہو تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسے روشنی سے نفرت ہے، وہ تاریکی ہی میں بھٹکنا چاہتا ہے۔

اٹکل کی پیروی کا سبب

'الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ'۔ یہ ان اٹکل کے تیر تکّے چلانے والوں کی صفت بیان ہوئی ہے جس سے اس بات کی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے خدا کی روشنی چھوڑ کر اپنا رہنما اٹکل

کو کیوں بنایا ہے! فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خواہشاتِ نفس کے اندھیرے میں گھرے ہوئے ہیں اور ان پر ایسی غفلت طاری ہے کہ اس کا تسلسل کبھی ٹوٹتا ہی نہیں کہ اس سے نکلنے کی کوشش کریں۔ 'غَمْرَۃٍ' سے مراد خواہشاتِ نفس اور مطامعِ دنیا کی تاریکی ہے۔ 'سَاھُوْنَ' خبر کے بعد دوسری خبر ہے جس سے ان کی غفلت کا تسلسل ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چیز ان پر اس طرح مسلّط ہے کہ وہ اس سے باہر نکلنے کا کبھی نام ہی نہیں لیتے۔ اگر کبھی کوئی ان کو جگانے اور حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ چیز ان کے دلوں پر شاق گزرتی ہے اور وہ اپنے کو مطمئن رکھنے کے لیے جو غلط سے غلط سہارا بھی مل جاتا ہے اس پر تکیہ کر لیتے ہیں۔

یَسْئَلُوْنَ اَیَّانَ یَوْمُ الدِّیْنِ (۱۲)

منکرینِ جزاء کا معارضہ

یعنی وہ جزاء و سزا سے آگاہ کرنے والوں کا منہ بند کرنے کے لیے یہ سوال کرتے ہیں کہ جس یوم الجزاء سے ڈرا رہے ہو وہ کہاں ہے؟ اس کا ظہور کب ہو گا! اس سوال کے اندر انکار، استہزاء اور جلد بازی تینوں ہی باتیں موجود ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر فی الواقع اس طرح کا کوئی دن آنے والا ہے تو وہ آتا کیوں نہیں! اس کے ڈراوے سنتے سنتے تو ہمارے کان پک گئے لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ یہ محض ایک ہوّا ہے جس سے تم ہمیں مرعوب کرنا چاہتے ہو۔ اگر اس کی کوئی حقیقت ہے تو اس کو لاؤ۔ اس کو دیکھے بغیر ہم تمھاری ان خیالی باتوں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں!

یہ سوال نقل کرنے سے قرآن کا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اس قماش کے لوگ حقائق سے گریز اختیار کرنے کے لیے اسی طرح کے بہانوں کی آڑ میں چھپتے ہیں حالانکہ انھیں اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ اگر یوم الجزاء کا آنا آفاق و انفس کے دلائل سے ثابت ہے اور اس کا ظہور اس کائنات کے خالق کی صفات کا لازمی تقاضا ہے تو اس دلیل سے اس کو نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ اس سے ڈرانے والے اس کو دکھا نہیں سکتے یا اس کا وقت نہیں بتا سکتے۔ اس قسم کا معارضہ ایک حقیقت کو ظن و تخمین سے جھٹلانے کے ہم معنی ہے اس وجہ سے قرآن نے ان لوگوں کے لیے 'خَرّٰصُوْنَ' کا لفظ استعمال فرمایا۔

یَوْمَ ھُمْ عَلَی النَّارِ یُفْتَنُوْنَ (۱۳)

جواب منکرین کی ذہنیت کے مطابق

یہ سوال تحقیق کے لیے نہیں بلکہ، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، انکار اور استہزاء کے لیے تھا، اس وجہ سے قرآن نے جواب ان کی ذہنیت کو پیشِ نظر رکھ کر دیا۔ یہ امر واضح رہے کہ جو لوگ اس طرح کے سوال کرتے تھے وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھے کہ اس کے ظہور کا وقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ کسی کو اس کا علم نہیں ہے اور اس کا علم نہ ہونے سے اصل حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کے وقت اور دن سے تعرض کرنے کے

بجائے اس صورتِ حال کی تصویر ان کے سامنے رکھ دی جس سے اس دن سابقہ پیش آئے گا کہ یہ جزا کا دن اس وقت ظہور میں آئے گا جب یہ آگ پر تپائے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو اڑا لیں لیکن یاد رکھیں کہ اس دن ان کا یہ حشر ہونا ہے۔

لفظ 'فتن' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہ لفظ جلانے اور تپانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور کسی کو امتحان میں ڈال کر جانچنے اور پرکھنے کے معنی میں بھی۔ یہاں 'یُفْتَنُوْنَ' سے دو معنوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک تو جلانے اور تپانے کے معنی کی طرف، دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ جس آگ پر یہ لوگ تپائے جائیں گے یہ ان شہوات و زخارف کی آگ ہوگی جن سے وہ دنیا میں آزمائے گئے اور جن کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ جزا کے دن سے بے پروا ہوئے۔ آگے اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ؕ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۱۴)

لفظ 'فِتْنَة' یہاں میرے نزدیک اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے یعنی دنیا کی وہ چیزیں جو تمھیں فتنہ میں ڈالنے والی بنیں اور جن کے عشق میں مبتلا ہو کر تم آخرت سے برگشتہ ہوئے، اپنی اصلی شکل و صورت میں وہ تمھارے سامنے نمایاں ہو گئیں، اب ان کا مزا چکھو۔ یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔

۲۔ ابر و ہوا کے تصرفات میں جزا اور سزا کی شہادت کے پہلو

یہاں تھوڑی دیر توقف کر کے اوپر کی قسموں اور ان کے مُقسَم علیہ کے باہمی تعلق پر مزید غور کر لیجیے تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ قسمیں درحقیقت اپنے مُقسَم علیہ پر دلیل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سورہ کی تمہید میں دو چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے اور ان قسموں کے بعد دو دعوے رکھے گئے ہیں۔ قسم ہواؤں کے عجائب تصرفات اور دھاریوں والے بادلوں کی کھائی گئی ہے اور دعویٰ ایک تو یہ کیا گیا ہے کہ جس عذاب کا تم کو ڈراوا دیا جا رہا ہے اس کو جھوٹ نہ سمجھو بلکہ یہ بالکل سچ ہے۔ دوسرا یہ کہ جس روزِ جزاء و سزا سے تم کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس کو بعید از امکان نہ خیال کرو بلکہ وہ پیش آ کے رہے گا۔

اب دعوے اور دلیل میں مطابقت کے پہلوؤں پر غور کیجیے۔ پہلا دعویٰ یہ ہے کہ 'اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ' (بے شک جس عذاب کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے وہ بالکل سچ ہے)۔ اس ٹکڑے کی شرح کرتے ہوئے ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ عذاب ہے جس سے ہر رسول نے

اپنی قوم کو ڈرایا کہ اگر اس نے اپنی تکذیب کی روش نہ بدلی تو وہ لازماً عذابِ الٰہی کی گرفت میں آجائے گی۔

اس دعوے پر اِردہوا کے تصرفات میں شہادت کا پہلو یہ ہے کہ کوئی قوم، خواہ کتنے ہی وسائل و ذرائع اور کتنی ہی قوت و جمعیت کی مالک ہو، وہ اپنے آپ کو خدا کی گرفت سے باہر نہ سمجھے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسے کوئی بڑی مورچہ بندی نہیں کرنی پڑتی بلکہ وہ اپنی ہواؤں اور اپنے بادلوں ہی کے ذریعہ سے جب چاہے اس کو فنا کر دے سکتا ہے۔ یہ جس طرح انسان کے وجود و بقا کے لیے ناگزیر ہیں اسی طرح اس کو فنا کر دینے کے لیے بھی بے پناہ ہیں۔ آگے تاریخ کی روشنی میں اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے اسی سورہ میں قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ لوط اور قومِ فرعون کی مثالیں پیش کی ہیں جن میں دکھایا ہے کہ ان قوموں کو بھی اپنی قوت و شوکت پر بڑا ناز تھا۔ اس غرور میں انھوں نے اللہ کے رسولوں کی وعید کا مذاق اڑایا اور مطالبہ کیا کہ جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو وہ لاؤ، ہم اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ بالآخر وہ عذاب ان پر آدھمکا اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا۔ وہی ہوا جو زندگی کے لیے ناگزیر ہے ان کے لیے طوفانِ قیامت بن گئی اور وہی ابر جس کو دیکھ کر وہ خوشی سے ناچنے لگے کہ هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (الاحقاف : ۲۴) (یہ ہم کو سیراب کرنے والا بادل ہے) ان کے لیے قہرِ الٰہی بن گیا۔ یہاں اس اشارے پر قناعت فرمائیے۔ آگے ان قوموں کی تباہی کی تفصیلات آ رہی ہیں۔ وہاں قرآن نے دکھایا ہے کہ دنیا کی یہ عظیم قومیں اسی غرور میں مبتلا ہوئیں جس میں قریش مبتلا ہیں بالآخر ان کو اللہ تعالیٰ کی ہواؤں اور اس کے بادلوں ہی نے چشم زدن میں خس و خاشاک بنا کر اڑا دیا اور وہ ان کے مقابل میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹک سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہ لشکر آج بھی موجود اور اس کے حکم کے منتظر ہیں۔ تاریخ ان کے کارناموں پر شاہد ہے!

اسی طرح دوسرے دعوے یعنی جزا اور سزا کے حق ہونے پر بھی یہ متعدد پہلوؤں سے شاہد ہیں۔

ہوا اور بادلوں کے باہمی تفاعل سے اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، رحمت اور ربوبیت کی جو شانیں ظاہر ہوتی ہیں ان سے قرآن نے جگہ جگہ متعدد بنیادی حقائق پر استدلال کیا ہے۔ ان کے اندر کوئی ایک نشانی نہیں ہے بلکہ گوناگوں نشانیاں موجود ہیں بشرطیکہ انسان ان پر غور کرے۔ اس باب میں ایک جامع آیت یہ ہے۔ فرمایا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ	بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ	اور دن کی گردش اور ان کشتیوں میں جو سمندر

الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ	میں لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور
النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ	اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے،
مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ	اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد
مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ	زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے
وَّتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ	اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان و
بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ	زمین کے درمیان مسخر ہیں ان لوگوں کے لیے
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○	بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لینے
(البقرۃ : ۱۶۴)	والے ہیں۔

اس آیت میں ہواؤں اور بادلوں کے تصرفات کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے اور آخر میں فرمایا ہے کہ ان کے اندر غور کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ یہ نشانیاں توحید، معاد، رسالت ہر چیز پر ہیں جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف ان نشانیوں کا بالاجمال حوالہ دیں گے جن کا تعلق مُقسم علیہ یعنی جزاء و سزا سے ہے۔

جزاء و سزا سے متعلق ایک بہت بڑا شبہ منکروں نے یہ پیش کیا کہ مر جانے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا بعید از قیاس ہے۔ یہ شبہ پچھلی سورہ میں تفصیل سے زیر بحث آ چکا ہے۔ اس شبہے کی تردید میں قرآن نے جو دلیلیں پیش کی ہیں ان میں ایک نمایاں دلیل، جس کا ذکر گوناگوں اسلوبوں سے بار بار ہوا ہے، ابر و ہوا کے تصرفات ہی سے تعلق رکھنے والی ہے۔ معاد کو مستبعد سمجھنے والوں کو جگہ جگہ یہ جواب دیا گیا ہے کہ تم آئے دن اس دنیا میں قدرت کا یہ کرشمہ دیکھتے ہو کہ زمین بالکل چٹیل اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے اور اس کے کسی گوشے میں بھی زندگی اور روئیدگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا کہ دفعۃً کسی گوشے سے ہوا اٹھتی ہے، وہ بادلوں کو ہانک کر لاتی ہے، ان کو ایک خاص علاقے کے افق پر تہ بہ تہ جماتی ہے۔ پھر بادلوں سے مینہ برسنے لگتا ہے اور دیکھتے دیکھتے تمام علاقہ جل تھل ہو جاتا ہے اور چند دن بھی گزرنے نہیں پاتے کہ وہی رقبہ جو بالکل مردہ تھا زندگی سے معمور ہو کر لہلہانے لگتا ہے۔ جس قدرت کی یہ شانیں آئے دن دیکھتے ہو تمہارے مر کھپ جانے کے بعد اگر وہ تمہیں زندہ کرنا چاہے گی تو یہ کام اس کے لیے کیوں ناممکن ہو جائے گا!

اسی طرح ابر و ہوا کے تصرفات سے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنی ربوبیت کا جو اہتمام فرمایا ہے اس سے بھی جگہ جگہ جزاء و سزا کے لازم ہونے پر استدلال فرمایا ہے۔ اس کی تقریر بالاجمال یوں ہے کہ دیکھتے ہو کہ آسمان بھی بند ہوتا ہے اور زمین بھی بند ہوتی ہے۔ نہ آسمان پانی برساتا اور نہ

زمین کوئی چیز اُگاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جانب سے ساز گار ہوائیں چلاتا ہے جو بوجھل بادلوں کو لاد کر لاتی ہیں اور زمین کو سیراب کر دیتی ہیں جس سے زمین اپنے خزانے اُگلنا شروع کر دیتی ہے۔ تمہارے باغ لہلہا اٹھتے ہیں، تمہارے کھیت شاداب ہو جاتے ہیں، تمہارے میدان سبزہ سے بھر جاتے ہیں، جن سے تم بھی بہرہ مند ہوتے ہو اور تمہارے جانور بھی۔ غور کرو کہ جس خدا نے تمہاری پرورش کا یہ اہتمام فرمایا ہے کہ اپنے آسمان و زمین اور اپنے ابر و ہوا سب کو تمہاری خدمت میں معروف کر رکھا ہے کیا وہ تم کو اپنے باغوں اور چمنوں میں عیش کرنے کے لیے اسی طرح چھوڑے رکھے گا، کوئی ایسا دن نہیں لائے گا جس میں وہ دیکھے کہ کس نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور شکرگزاری کی زندگی بسر کی اور کس نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اسی کے خلاف بغاوت کے لیے استعمال کیا! ہر نعمت کا یہ حق ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے اور ہر نعمت کے ساتھ مسئولیت کا شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ اس شعور سے عاری صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی فطرت کو بالکل مسخ کر لیتے ہیں۔

اسی طرح ابر و ہوا کے تصرفات سے اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ مکافات پر بھی شہادت پیش کی ہے کہ انہی ہواؤں اور بادلوں کو دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کے لیے رحمت بنا دیتا ہے اور دوسری قوم کے لیے عذاب۔ انہی ہواؤں کے تصرف سے اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات بخشی اور انہی کی گردش سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس خلق کا خالق دیان ہے۔ وہ نیکوں اور بدوں کے ساتھ ایک ہی معاملہ نہیں کرے گا بلکہ ہر ایک کے ساتھ اپنے عدل اور اپنی رحمت کے تقاضوں کے مطابق معاملہ کرے گا۔ اوپر ہواؤں کی تعریف میں فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا کے جو الفاظ آئے ہیں ان کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ان ہواؤں کی یہ صفت گویا ان کے خالق کی صفت عدل کا مظہر ہے جس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ایک دن ایسا لازماً آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ تقسیمِ امر فرمائے گا جو نجات و رحمت کے حقدار ہوں گے ان کو رحمت و مغفرت سے نوازے گا اور جو عذاب و عقاب کے سزاوار ہوں گے ان کو جہنم میں جھونک دے گا۔

۳۔ آگے آیات ۱۵-۱۹ کا مضمون

اوپر ان لوگوں کا ذکر گزرا ہے جو جزا و سزا سے بالکل نچنت لاابالیانہ زندگی گزارتے رہے۔ اگر کسی نے اس خوابِ غفلت سے ان کو بیدار کرنے کی کوشش کی تو اس کا منہ انھوں نے اس جواب سے بند کرنے کی کوشش کی کہ جزا و سزا کا کوئی دن ہے تو وہ کہاں ہے؟ اس کو لاؤ۔

اور دکھائو۔ اب ان کے مقابل میں ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو اس دن کو ایک حقیقت سمجھ کر برابر اس سے ڈرتے اور اس کے لیے تیاریوں میں مصروف رہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۱۹

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٥﴾ آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ ﴿١٦﴾ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ﴿١٧﴾ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿١٨﴾ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿١٩﴾

ترجمۂ آیات ۱۵-۱۹

بے شک پرہیزگار باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ پا رہے ہوں گے جو کچھ ان کے رب نے ان کو بخشا۔ بے شک وہ اس سے پہلے خوب کاروں میں تھے۔ وہ راتوں میں کم ہی سوتے تھے اور صبح کے وقتوں میں مغفرت مانگتے تھے اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق تھا۔ ۱۵ - ۱۹

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (۱۵)

تقویٰ کی رُوح

'مُتَّقِینَ' ایک جامع صفت ہے جو قرآن میں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوئی ہے جو خدا کے مقرر کردہ حدود و قیود کے اندر زندگی گزارنے والے ہیں۔ یہاں بھی اصلاً مراد وہی ہیں لیکن اوپر کی آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہوا ہے جو آخرت اور جزا و سزا سے نچنت لا ابالیانہ زندگی گزارتے ہیں اس وجہ سے یہاں، تقابل کے اصول پر، اس صفت کے اندر جزا و سزا کے اندیشہ کا پہلو نمایاں ہے یعنی اس سے خاص طور پر وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے زندگی میں جو قدم بھی اٹھائے یہ سوچ کر اٹھائے کہ ایک دن ہر قول و فعل کا حساب دینا اور حدودِ الٰہی سے ہر تجاوز کی سزا بھگتنی ہے۔ درحقیقت جزا و سزا کا یہی اندیشہ تقویٰ کی اصل روح ہے۔ جس تقویٰ کے اندر یہ رُوح نہ ہو وہ محض نمائشی اور کاروباری تقویٰ ہے جس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ ان لوگوں کی نسبت فرمایا کہ بے شک یہ لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ اوپر لا اُبالیانہ زندگی گزارنے والوں

کا انجام یہ بیان ہوا کہ وہ جن زخارف پر ریجھ کر آخرت سے بے پروا ہوئے انہی کی آگ پر تپائے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ اب ان زخارف کا مزہ چکھو۔ اس کے برعکس ان لوگوں نے چونکہ آخرت کے مقابل میں دنیا کے زخارف کو کوئی وقعت نہیں دی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو باغوں اور چشموں میں اتارے گا۔ 'جَنّٰت' اور 'عُیون' دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ آخرت کی نعمتوں کی جامع تعبیر ہیں۔ 'فِیْ' یہاں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لوگ جنت کی نعمتوں میں بالکل گھرے ہوئے ہوں گے۔ ان کے لیے ہر طرف نعمت ہی نعمت ہوگی۔

اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ (۱۶)

جنھوں نے دنیا میں خدا کی پابندیوں کا احترام کیا ان کے لیے آخرت میں آزادی

یہ ان نعمتوں سے ان کے آزادانہ متمتع ہونے کی تصویر ہے۔ 'اٰخِذِیْنَ' حال واقع ہے اس وجہ سے میرے نزدیک یہ صورتِ حال کی تصویر کا فائدہ دے رہا ہے یعنی وہ دمبدم وہ کچھ پا رہے ہوں گے جو ان کے رب نے ان کو عطا فرمایا۔ 'مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ' میں صیغۂ ماضی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جہاں تک دیے جانے کا تعلق ہے اس کا فیصلہ اور وعدہ تو ان کے رب نے پہلے ہی سے کر رکھا ہے، اس بات میں ان کو کسی نئے فیصلے کا انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ اب صرف ان نعمتوں سے متمتع و محظوظ ہونے کا دَور ہوگا۔ وہ جس چیز کے خواہشمند ہوں گے اپنے رب کے بخشے ہوئے غیر فانی ذخائر میں سے لیں گے اور جتنا چاہیں گے اور جب چاہیں گے لیں گے۔ ان کے اوپر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ انھوں نے دنیا میں اپنے رب کی عائد کردہ پابندیوں کا احترام کیا۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ ان کو تمام نعمتیں بخش کر آزاد چھوڑ دے گا کہ اب ان سے جس طرح چاہو متمتع ہو، تم پر کوئی پابندی باقی نہیں رہی۔

تقویٰ کے اندر احسان کی روح

'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ'۔ یہ ان کے اوپر اس بے پایاں انعام کی علت بیان ہوئی ہے کہ یہ لوگ اس سے پہلے دنیا کی زندگی میں 'محسنین' میں رہے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان پر یہ انعام فرمائے گا۔ 'محسنین' کا ترجمہ ہم نے اس کتاب میں جگہ جگہ 'خوب کار' کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے رب کے ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے۔ یہ صفت صرف ان لوگوں کے اندر پیدا ہوتی ہے جن کے اندر جزا و سزا کا عقیدہ راسخ ہو۔ یہ عقیدہ جن کے اندر راسخ ہوتا ہے وہ ہر کام اس طرح کرتے ہیں گویا وہ خدا کو دیکھ رہے ہیں، اس لیے کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر وہ خدا کو نہیں دیکھ رہے ہیں تو خدا تو بہرحال ان کو دیکھ رہا ہے۔

'متّقین' کے لیے 'محسنین' کا لفظ استعمال کر کے ان کے باطن پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ لوگ چونکہ جزا و سزا پر یقین رکھنے والے تھے اس وجہ سے ان کا تقویٰ محض ظاہر دارانہ تقویٰ

نہیں تھا بلکہ اس کے اندر احسان کی روح بھی تھی۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہی تقوٰی اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر و قیمت رکھتا ہے اور یہ جزا و سزا کے راسخ اعتقاد سے پیدا ہوتا ہے۔

تقوٰی اور احسان کی بعض علامات

كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ (۱۷)

یہ ان کے تقوٰی اور احسان کی علامات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ راتوں کو کم سوتے تھے یعنی وہ بے فکروں اور لاابالیوں کی طرح اپنی راتیں عیش کے بستروں میں نہیں بلکہ روزِ حساب کی تیاریوں میں گزارتے تھے، ان کی راتوں کا زیادہ حصہ خدا کے آگے سجود و قیام اور ذکر و فکر میں بسر ہوتا۔

یہ فکرِ آخرت کا ایک لازمی اثر بیان ہوا ہے۔ جن کو آخرت کی فکر ہوتی ہے وہ گھوڑے بیچ کر نہیں سوتے۔ ان کو یہ اندیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ ممکن ہے یہ زندگی کی آخری رات ہو اس وجہ سے ان کی نیند کھٹکے کی نیند ہوتی ہے۔ وہ راتوں میں اٹھ اٹھ کر اپنے رب کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ اسی طرح کے لوگوں کا حال دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (السجدۃ ۱۶) (ان کے پہلو بستروں سے دور رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، بیم و امید کے ساتھ، اور جو روزی ہم نے ان کو بخشی ہے اس میں سے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں)۔

اس جملہ کی تالیف کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں، لیکن مطلب ہر شکل میں ایک ہی ہوگا۔ ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ اِنَّهُمْ كَانُوا قَلِيلًا هُجُوعُهُمْ (ان کا شب میں سونا تھوڑا تھا) دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ كَانُوا يَهْجَعُونَ قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ (رات میں وہ تھوڑا سوتے تھے) الغرض نحوی تالیف کی صورتیں تو مختلف ہو سکتی ہیں لیکن مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہوگا بعض لوگوں نے اس کا مفہوم اس سے مختلف لیا ہے، لیکن ان کی رائے عربیت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے نظائر کے بھی اس وجہ سے اس سے تعرض کی ضرورت نہیں ہے۔

'هُجُوع' کے معنی سونے کے ہیں اور اس آیت سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اہلِ تقوٰی اور اہلِ احسان کی یہ خاص علامت ہے کہ وہ رات میں کم سوتے ہیں، زیادہ حصہ اس کا وہ اللہ تعالیٰ کی یاد، ذکر و فکر اور توبہ و استغفار میں گزارتے ہیں۔ یہی بات قرآن کے نظائر سے بھی نکلتی ہے، مثلاً يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا (المزمل: ۱-۲) (اے چادر میں لپٹنے والے، رات میں قیام کر، بجز تھوڑے حصہ کے) اس کے بعد مقدار کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ (المزمل: ۳-۴) (آدھی رات قیام کر یا اس سے کچھ کم کر دے یا اس پر کچھ اضافہ کر لے)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ شب بیداری ان اہلِ تقوٰی کی خاص علامات میں سے ہے

جو مرتبۂ احسان پر فائز ہیں اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ اس مرتبہ کے حصول کی تمنا رکھتے ہیں ان کے لیے بھی اس کا اہتمام لازمی ہے۔ رہے ہما شما جو ان عقبات کو عبور کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو ان کے لیے بعض رخصتیں ہیں جن کی وضاحت ان شاء اللہ سورۂ مزمل کی تفسیر میں آئے گی۔

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ (۱۸)

پَو پھٹنے سے کچھ پہلے کا وقت سحر کا وقت ہے۔ یہ ان کی تمام شب خیزی اور تمام رکوع و سجود کی غایت بیان ہوئی ہے۔ یعنی آخری کام ان کا یہ ہوتا ہے کہ سحر کے وقت اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں کہ رب کریم جزا و سزا کے دن ان کے گناہوں سے درگزر فرمائے اور ان کو اپنے دامنِ عفو و کرم میں جگہ دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ نہ تو اس بات کے متوقع ہوتے کہ اس تبتل الی اللہ اور رکوع و سجود کے صلہ میں ان کو حضور و شہود کا کوئی بڑا مقام حاصل ہوگا اور نہ وہ اس طرح کی کسی چیز کے طلبگار ہی بنتے بلکہ ان کی طلب صرف یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ چنانچہ ان کی شب کی تمام عبادت و ریاضت کا اختتام استغفار پر ہوتا ہے۔

اسلام میں عبادت و ریاضت کا اصل مقصد

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اسلام میں عبادت و ریاضت کا مقصود دوسرے مذاہب سے بالکل مختلف ہے۔ دوسرے مذاہب میں عبادت و ریاضت کا اصل مقصود کشف، مشاہدہ، تجلی ذات، ذات خداوندی میں انضمام اور اس قبیل کی دوسری چیزیں ہیں۔ جوگی، سنیاسی اور راہب جو ریاضتیں کرتے ہیں ان سے ان کے پیشِ نظر یہی چیزیں ہوتی ہیں، لیکن اسلام میں ریاضت و عبادت کا اصل مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز اگر عبادت کے مقصد کی حیثیت حاصل کر لے تو اسلام میں اس عبادت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہندوؤں کے فلسفہ سے متاثر ہو کر ہمارے ہاں صوفیوں کے ایک طبقہ نے بھی عبادت و ریاضت کا مطمحِ نظر انہی چیزوں کو بنا لیا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا اس وجہ سے ان کے تزکیۂ نفس کی ساری جدوجہد نے ایک بالکل ہی مختلف راہ اختیار کر لی۔ یہاں اس مسئلہ پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے اپنی کتاب 'تزکیۂ نفس' میں اس کے بعض پہلو واضح کیے ہیں۔

استغفار کے لیے سازگار ساعت

قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ استغفار کے لیے سب سے زیادہ سازگار وقت آخرِ شب اور سحر کا وقت ہے۔ اس وقت، جیسا کہ مشہور حدیث قدسی سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت استغفار کرنے والوں کے انتظار میں ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت سے فائدہ اٹھانے کا حوصلہ صرف طالبِ صادق ہی کر سکتے ہیں۔ ہر بوالہوس یہ حوصلہ نہیں کر سکتا کہ رات رکوع و سجود میں گزارے۔ پھر صبح کو مغفرت کا سائل بن کر اپنے رب کے دروازے پر حاضر ہو۔ اللہ کے جو بندے یہ حوصلہ دکھاتے

ہیں ان کا یہ حوصلہ ہی ان کے اخلاص کا ضامن ہوتا ہے، اس وجہ سے اللہ کی رحمت ان کی طرف ضرور متوجہ ہوتی ہے۔ اصل جالب رحمت تو بندے کا خلوص ہے۔ جب یہ چیز موجود ہے تو اللہ تعالیٰ کے پاس فضل و رحمت کی کیا کمی ہے!

وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ (۱۹)

محسنین خدا کے حقوق کی طرح بندوں کے حقوق بھی پہچانتے ہیں

یعنی یہ 'محسنین' جس طرح خدا کا حق پہچاننے والے ہیں اسی طرح اس کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے مالوں میں صرف اپنے نفس ہی کا حق نہیں، بلکہ سائلوں اور محروموں کا حق بھی سمجھتے ہیں اور اس کو اسی طرح ادا کرتے تھے جس طرح اہلِ حق کے حقوق ادا کیے جاتے ہیں یعنی وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ ان کے پاس جو مال ہے وہ تنہا انہی کا ہے بلکہ وہ اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہیں کہ خدا نے اگر ان کی ناگزیر ضروریات سے ان کو زیادہ دیا ہے تو یہ دوسروں کا حق ہے جو ان کی امانت میں دیا گیا ہے۔ اس امانت کا یہ حق ہے کہ وہ اس کے مستحقین کو ادا کی جائے۔ اگر یہ امانت ادا نہ کی گئی تو یہ خیانت ہوگی اور ہر خیانت کی خدا کے ہاں پرسش ہوتی ہے۔

'محروم' سے کون مراد ہیں؟

'محروم' سے مراد یوں تو ہر وہ شخص ہے جو مال سے محروم ہو لیکن اس کے مفہوم میں وہ لوگ خاص طور پر شامل ہیں جو پہلے صاحبِ مال رہے ہوں بعد میں کسی افتاد نے ان کو محروم بنا دیا ہو۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے قرآن میں لفظ 'غارمین' استعمال ہوا ہے اور ان کو صدقات کے مستحقین میں شامل کیا گیا ہے۔ محرومین میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو احتیاج کے باوجود سوال کرنے کا ننگ گوارا نہیں کرتے۔ خاص طور پر جو لوگ کبھی صاحبِ مال رہ چکے ہوں ان کو اپنی خودداری بہت عزیز ہوتی ہے۔ یہاں یہ لفظ چونکہ 'سائل' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ محتاج ہیں جو سوال نہیں کرتے۔ اس طرح کے خودداروں کی خودداری کی لاج رکھنا بہت بڑی نیکی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اس طرح کے محتاجوں کی مدد کے لیے مال رکھنے والوں کو خود ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ مال داروں کے دروازوں پر سائل بن کر حاضر ہوں گے۔ سورۂ بقرہ میں اس طرح کے خودداروں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔

لِلۡفُقَرَآءِ ٱلَّذِينَ أُحۡصِرُواْ فِي	یہ صدقات ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کی
سَبِيلِ ٱللَّهِ لَا يَسۡتَطِيعُونَ	راہ میں معروف ہیں، تلاش معاش کی جدوجہد
ضَرۡبٗا فِي ٱلۡأَرۡضِ يَحۡسَبُهُمُ	میں زمین میں نقل و حرکت نہیں کر سکتے۔ ان کے
ٱلۡجَاهِلُ أَغۡنِيَآءَ مِنَ ٱلتَّعَفُّفِ	حال سے ناواقف ان کی خودداری کے سبب
تَعۡرِفُهُم بِسِيمَٰهُمۡ لَا	سے ان کو غنی سمجھتے ہیں۔ تم ان کو چہرے بشرے

یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ (البقرۃ: ۲۷۳) — سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔

۵۔ آگے آیات ۲۰-۲۳ کا مضمون

آگے کی آیات میں سورہ کے اصل عمود یعنی جزا و سزا کے مضمون کو ازسرِ نو لیا ہے۔ اوپر صرف ابر و ہوا کے تصرفات سے استدلال تھا آگے آفاق و انفس کے ان تمام دلائل کی طرف اشارہ فرمایا جو اس کائنات کے ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں بشرطیکہ لوگ ان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں کھولیں اور ان سے جو نتائج سامنے آتے ہیں ان پر یقین کریں۔ فرمایا۔

آیات ۲۰-۲۳

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾

ع ۱ ۲۳ ۱۸

ترجمۂ آیات ۲۰-۲۳

اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمھارے اندر بھی، کیا تم دیکھتے نہیں؟ اور آسمان میں تمھاری روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے۔ پس آسمان و زمین کے خداوند کی قسم، یہ بات شدنی ہے، جس طرح تم بول دیتے ہو۔ ۲۰-۲۳

۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ (۲۰)

آسمان و زمین اور انسان کے اندر کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اوپر جزا و سزا کی جو نشانیاں مذکور ہوئی ہیں اس آیت کا عطف انہی پر ہے۔ ابر و ہوا کی نشانیوں کا تعلق زمین و آسمان کے درمیان کی نشانیوں سے ہے۔ اب آگے آسمان و زمین اور خود انسان کے اندر کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی اور اقرب فالاقرب کے اصول پر سب سے

پہلے زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ فرمایا، اس کے بعد انفس کی نشانیوں کی طرف، پھر آسمان کی نشانیوں کی طرف۔ یوں تو ان چیزوں سے قرآن نے اپنی دعوت کے تمام بنیادی حقائق ——— توحید، معاد، رسالت ——— پر استدلال کیا ہے جس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے لیکن یہاں سورہ کے عمود کے تقاضے سے صرف معاد اور جزاو سزا کی نشانیوں ہی کی طرف اشارہ ہے اس وجہ سے ہم بھی اپنی بحث صرف جزاو سزا کے دلائل ہی تک محدود رکھیں گے، اور جس طرح قرآن نے اشارے پر اکتفا کیا ہے اسی طرح ہم بھی اشارات ہی پر اکتفا کریں گے اس لیے کہ یہ تمام بحثیں پچھلی سورتوں میں پوری تفصیل سے گزر چکی ہیں۔

سب سے پہلے سورۂ نبا کی مندرجہ ذیل آیات پر ایک نظر ڈال لیجیے جن میں قرآن نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی مختلف چیزوں سے معاد اور جزاو سزا پر استدلال فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۙ وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۙ وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ۙ وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۙ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۙ (النبا: ۶-۱۷)	کیا ہم نے زمین کو ایک گہوارہ نہیں بنایا؟ اور اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں گاڑیں؟ اور تم کو جوڑے جوڑے نہیں پیدا کیا؟ اور تمھاری نیند کو دافع کلفت نہیں بنایا؟ اور رات کو پردہ پوش نہیں بنایا؟ اور دن کو معاش کا وقت نہیں ٹھہرایا؟ اور تمھارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے اور اس میں ایک روشن چراغ نہیں رکھا؟ اور بدلیوں سے دھڑا دھڑا پانی نہیں برسایا تاکہ اس سے غلّے اور نباتات اور گھنے باغ اگائیں؟ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے!!

ان آیات میں اپنی قدرت، رحمت اور ربوبیّت کے ان گوناگوں آثار سے، جو آسمان، زمین اور ان کے درمیان موجود ہیں اور جن کا مشاہدہ ہر شخص بادنیٰ توجہ کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت ثابت کی ہے کہ یہ کارخانہ بے مقصد اور عبث نہیں ہو سکتا اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس کا خالق نیکوں اور بدوں کے درمیان فیصلہ فرمائے۔ اس دلیل کے ہر پہلو کی وضاحت سابق سورتوں کی تفسیر میں ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم مختصر الفاظ میں زمین کی چند نشانیوں کی طرف، جو جزاو سزا پر دلیل ہیں، اشارہ کریں گے۔

زمین کی نشانیوں سے امکانِ معاد پر استدلال

امکانِ معاد پر قرآن نے زمین کے آثار سے یوں دلیل قائم کی ہے کہ دیکھتے ہو کہ زمین بالکل مردہ

اور بے آب و گیاہ ہوتی ہے، اس کے کسی گوشے میں بھی زندگی و روئیدگی کا کوئی نشان نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کی گھٹا بھیجتا ہے اور بارش کا ایک ہی چھینٹا اس کو زندگی اور شادابی سے معمور کر دیتا ہے۔ غور کرو کہ جو خدا اپنی قدرت کی یہ شان برابر دکھا رہا ہے وہ لوگوں کے مرکھپ جانے کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کرنا چاہے گا تو کیا نہیں کر سکے گا۔

۔ اس زمین میں رب کریم نے اپنے بندوں کی پرورش کے لیے جو گوناگوں اہتمام کر رکھے ہیں ان کا حوالہ دے کر یہ سوال کیا ہے کہ کیا جس رب کریم نے تمھاری پرورش کے لیے یہ سامان کر رکھا ہے وہ تمھیں اس زمین میں یوں ہی مطلق العنان چھوڑے رکھے گا اور کوئی ایسا دن نہیں لائے گا جس میں وہ ان لوگوں سے بازپرس کرے جنھوں نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اسی کے خلاف بغاوت کا ذریعہ بنایا ہو اور ان لوگوں کو انعام دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا ہو! کیا تم ایسے حکیم و کریم پروردگار کے متعلق یہ گمان رکھتے ہو کہ وہ کوئی کھلنڈرا ہے جس کی نگاہوں میں نیکی و بدی یکساں ہے اور کیا تم اس فریب نفس میں مبتلا ہو کہ تمھارے رب کی یہ بے پایاں نعمتیں تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتیں!

۔ اس زمین میں قوموں کی تباہی کے جو آثار ہیں قرآن نے ان کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور واضح فرمایا ہے کہ یہ قومیں اپنے طغیان و تمرد کے باعث اللہ کے عذاب سے تباہ ہوئیں۔ ان کی تباہی کے بعد ان کے آثار اس نے اس لیے محفوظ رکھے ہیں کہ ان کے بعد آنے والی قومیں ان سے سبق حاصل کریں کہ اس کائنات کا خالق اس دنیا کے خیر اور شر سے بے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ جب کسی قوم کا طغیان حد سے متجاوز ہو جاتا ہے تو وہ لازماً اس کے قانونِ مکافات سے دوچار ہوتی ہے۔ قوموں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ ایک ایسا دن بھی وہ لائے گا جس میں اس کا ہمہ گیر عدل ظاہر ہوگا۔ ہر شریر اپنی شرارت کی سزا بھگتے گا اور ہر نیکوکار اپنی نیکی کا بھرپور صلہ پائے گا۔

یہ زمین کے چند نہایت واضح آثار کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے جو جزا و سزا پر دلیل ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی گوناگوں نشانیاں ہیں جن کی طرف قرآن نے توجہ دلائی اور ہم نے اس کتاب میں ان کی وضاحت کی ہے۔ یہاں ان کے اعادے میں طوالت ہوگی۔

حقائق کو ماننے کا حوصلہ نہ ہو تو دلائل کام نہیں دیتے

'لِّلْمُوْقِنِیْنَ' یعنی زمین میں نشانیوں کی تو کمی نہیں ہے۔ قدم قدم پر نشانیاں موجود ہیں۔ بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں، غور کرنے والی عقلیں اور غور و فکر کے نتائج پر یقین کرنے والے دل ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک حقیقت کو قبول کرنے کے لیے مجرد یہ چیز کافی نہیں ہے کہ اس کے دلائل موجود ہیں بلکہ اس کے لیے یہ چیز بھی ضروری ہے کہ مخاطب کے اندر دلائل پر غور کرنے

اور ان کے بدیہی نتائج کو تسلیم کرنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر آدمی کے اندر یہ ارادہ نہ ہو تو وہ واضح سے واضح حقیقت کو جھٹلا دینے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر ہی لیتا ہے۔ اس دنیا میں حقائق کی تکذیب صرف اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ ان کے حق میں دلائل نہیں تھے یا ان کو پیش کرنے والے موجود نہیں تھے بلکہ اکثر و بیشتر زمانے کی خواہش ان کی تکذیب کی محرک ہوئی ہے اور یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

وَفِيٓ أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۲۱)

انفس کے بعض دلائل کی طرف اشارہ

یہ روزِ جزا و سزا پر انفس کے دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن نے جس طرح آفاق سے اپنی دعوت کے تمام بنیادی اجزا پر استدلال کیا ہے۔ اسی طرح انفس سے بھی تمام اصولی مطالب پر دلیل قائم کی ہے جن کی وضاحت اس کتاب میں ان کے محل میں ہم کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں ہم بالاجمال صرف جزا و سزا سے متعلق چند باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

— قرآن نے جگہ جگہ انسان کی خلقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو خدا حقیر پانی کی ایک بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزار کر، ایک بھلا چنگا انسان بنا کھڑا کرتا ہے اور اس کو گوناگوں ظاہری و باطنی صلاحیتوں سے آراستہ کر دیتا ہے کیا اس کے لیے یہ ناممکن خیال کرتے ہو کہ تمہارے مر کھپ جانے کے بعد تم کو از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے اور تمہارے تمام اعمال و اقوال کا حساب کرے! جب پہلی بار تمہارا پیدا کیا جانا اس کے لیے ناممکن نہیں ہوا تو دوبارہ یہی کام اس کے لیے کیوں ناممکن ہو جائے گا! اسی ضمن میں جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ ہر آدمی ہر روز اپنے اندر زندگی، موت، برزخ اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے مشاہدات کو یوں ہی نہ گزر جانے دے بلکہ ان پر غور کرنے کی عادت بھی ڈالے۔

انسان کے مرتبۂ خلافت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ خدا کے آگے اس کی پیشی ہو

— انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل، ادراک اور علم کی جن صلاحیتوں سے آراستہ فرمایا ہے اور جن فطری قوتوں اور قابلیتوں سے اس کو مسلح کیا ہے، ان کی روشنی میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ انسان زمین کے دوسرے جانداروں کی طرح اس زمین ہی کی مخلوق نہیں ہے بلکہ اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ خدا کی طرف سے ایک خاص دائرہ میں اختیار و ارادہ کی امانت کا حامل ہو کر آیا ہے جس کی بنا پر خدا نے اس کو اپنی خلافت کے مرتبۂ بلند پر سرفراز فرمایا ہے۔ اس امانت و خلافت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ ایک دن وہ اپنے رب کے آگے پیش ہو تاکہ جس نے اس امانت و خلافت کا حق ادا کیا ہو وہ اس کا ابدی انعام حاصل کرے اور جس نے اس امانت میں خیانت اور خلافت پا کر بغاوت کا ارتکاب کیا ہو وہ اس کی ابدی سزا بھگتے۔ گویا جزا و سزا انسان کے مرتبۂ خلافت پر سرفرازی کا ایک لازمی اور بدیہی تقاضا ہے۔ یہ دلیل قرآن میں بھی بیان ہوئی ہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی اس کو نہایت

خوبصورت تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے۔

انسان کے اندر نفس لوّامہ کا وجود قیامت کے وجود کی دلیل ہے

— تیسری اہم حقیقت جو سورۂ قیامہ میں خاص اہتمام کے ساتھ واضح فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک نفس لوّامہ ودیعت فرمایا ہے جو اس کو، جب وہ کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے، ملامت کرتا ہے۔ اسی نفس لوّامہ کی قسم کھا کر جزاء و سزا کے حق ہونے پر اس کو شہادت میں پیش کیا ہے کہ اگر انسان کو وجود میں لانے والا نیکی پر انعام اور بدی پر سزا دینے والا نہ ہوتا تو انسان کے اندر وہ اس نفس لوّامہ کو کیوں ودیعت فرماتا جو اس کو ہمیشہ ایک خلش میں مبتلا رکھے؟ اس کا ودیعت کیا جانا تو اس بات کی نہایت واضح شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس مجموعی کائنات کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو روزِ قیامت مقرر کر رکھا ہے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہر انسان کے سینے میں رکھ دے جو اس کو برابر اس حقیقت کی یاد دہانی کرتا رہے کہ جس خدا نے اس کو وجود بخشا ہے وہ اس کی نیکی اور بدی سے بے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ جزاء و سزا دینے والا ہے۔ گویا یہ انسان کے اندر ایک چھوٹی سی عدالت اس عدالتِ کبریٰ کی یاد دہانی کے لیے ہے جو قیامت کے دن قائم ہو گی۔ اسی بنا پر انسان کو عالمِ اصغر کہا گیا ہے اس لیے کہ اس پورے عالم کا ایک عکس اس کے آئینہ میں موجود ہے۔

سورۂ قیامہ میں فرمایا گیا ہے کہ جزاء و سزا کی شہادت ہر آدمی خود اپنے اندر پا رہا ہے اگرچہ وہ اس کی تکذیب کے لیے کتنے ہی بہانے پیدا کرے، 'بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ' (القیامۃ: ۱۴-۱۵) اسی طرح اسی سورہ میں یہ بات بھی فرمائی گئی ہے کہ جو شخص کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کی عدالت کے سامنے جرم کرتا ہے، 'بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ' (القیامۃ: ۵) (بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اس کے سامنے شرارت کرے) اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ خدا کی ایک چھوٹی سی عدالت اس کے ضمیر کے اندر ہی موجود ہے اس وجہ سے جو شخص بھی کوئی جرم کرتا ہے وہ درحقیقت اسی عدالت کے سامنے کرتا ہے اور یہ اس کی ایک کھلی ہوئی جسارت ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'نفس لوّامہ' انسان کو متنبہ کرنے کا فرض اس وقت تک برابر انجام دیتا رہتا ہے جب تک انسان اس کی مسلسل خلاف ورزی سے اس کو بالکل مردہ نہ بنا دے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔

'اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ'۔ انسان کا نفس چونکہ اس سے سب سے زیادہ قریب ہے اس وجہ سے فرمایا کہ کیا اتنی قریب کی نشانیاں بھی تم کو نظر نہیں آ رہی ہیں! یعنی اگر زمین کے اطراف و اکناف تمہارے احاطے سے باہر ہیں، اگر آسمان تمہاری دسترس سے بعید ہے تو کیا تمہارا نفس بھی تم سے دور ہے

کہ تم اس کے اندر جھانک کر ان نشانیوں کو نہیں دیکھ سکتے!

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (۲۲)

آسمان کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اب یہ آسمان کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ دیکھو اس کے اندر تمہارا رزق بھی ہے اور وہ عذاب بھی ہے جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے۔ 'رزق' سے مراد بارش ہے جو رزق کا ذریعہ بنتی ہے۔ سبب بول کر مراد اس سے مسبّب کو لیا ہے جو عربیت کا معروف اسلوب ہے۔ 'وَمَا تُوعَدُونَ' سے، جیسا کہ آیت ۵ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، وہ عذاب مراد ہے جس سے لوگوں کو پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں آگاہ کیا جا رہا تھا۔ اس کی مثالیں قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں اور ان میں سے بعض کا حوالہ آگے اسی سورہ میں آ رہا ہے۔

یعنی یہ آسمان تو آئے دن تمہارے سامنے جزا و سزا کی شہادت دیتا رہتا ہے اسی کے اندر سے اللہ تعالیٰ تمہارا رزق بھی برساتا ہے اور اسی کے اندر سے نافرمانی و سرکشی کرنے والوں پر جب چاہے عذاب بھی برسا دیتا ہے۔ نہ رحمت کے لیے اسے کوئی الگ اہتمام کرنا پڑتا اور نہ نقمت کے لیے کوئی الگ توپ نصب کرنی پڑتی۔ تو جس کا یہ جمال و جلال برابر دیکھتے ہو اس سے کیوں بعید سمجھتے ہو کہ وہ جب چاہے اسی چیز کو تمہاری تباہی کا ذریعہ بنا دے جو تمہاری زندگی کا ذریعہ ہے! پھر جس کی رحمت و نقمت کی یہ شانیں اس دنیا میں دیکھ رہے ہو آخر یہ کیوں یقین نہیں کرتے کہ وہ خیر و شر کے معاملے میں بے تعلق یا غیر جانبدار نہیں ہے بلکہ وہ بروں کو لازماً سزا دے گا اور نیکوکاروں کو لازماً صلہ دے گا۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ (۲۳)

خلاصۂ بحث

اب یہ ان تمام نشانیوں کو سمیٹ دیا اور آسمان و زمین دونوں کے رب کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس روزِ جزا و سزا کی تم کو یاد دہانی کی جا رہی ہے اور پیغمبر کی تکذیب کے جس نتیجہ سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے وہ شدنی ہے۔ اس میں خدا کو ذرا بھی مشکل نہیں پیش آئے گی۔ جس طرح تمہارے لیے زبان سے کوئی لفظ بول دینا نہایت آسان ہے اسی طرح خدا کے لیے یہ سب کچھ کر دینا نہایت آسان ہے۔ اس کے سارے کام اس کے کلمۂ 'کُن' سے ہو جاتے ہیں۔

'إِنَّهُ' میں ضمیر کا مرجع وہی مقسم علیہ ہے جو اوپر گزر چکا ہے یعنی 'إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ۝ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ ۝' اس کا ذکر اوپر ہو چکا تھا اس وجہ سے اس کی طرف اشارہ کے لیے ضمیر کافی ہوئی۔ پہلے آسمان و زمین کی چند نشانیوں کا حوالہ دے کر اس کی قسم کھائی پھر پورے آسمان و زمین کے رب کی قسم کھا کر وہی بات دُہرا دی جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جس طرح ہر صنعت سے اس کے صانع کے مزاج و مذاق کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح آسمان و زمین کی نشانیوں سے ان کے

خالق کی صفات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جزا و سزا دینے والا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کے بنائے ہوئے آسمان اور زمین میں یہ چیز کہاں سے نمایاں ہوتی؟

قیامت کے وقوع کی وضاحت ایک مثال سے

'اِنَّہٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّکُمْ تَنْطِقُوْنَ'۔ لفظ 'حَقٌّ' کے اندر دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جزا و سزا ایک حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ شدنی ہے۔ اس کے وقوع کو کوئی ناممکن نہ خیال کرے۔ جب اس کا وقت آجائے گا تو خدا اس کو پلک جھپکتے سامنے کر دے گا۔ اس کا ایک حقیقت ہونا اوپر کے دلائل آفاق و انفس سے واضح ہو چکا ہے۔ اب یہ اس کے وقوع کو ایک تمثیل سے واضح فرمایا ہے کہ یہ کام آسمان و زمین کے رب کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جب اس نے آسمان و زمین پیدا کر دیے اور اس کام میں اس کو ذرا مشکل پیش نہیں آئی تو لوگوں کو حساب کتاب کے لیے دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اس کے لیے کیوں مشکل ہوگا؟ جس طرح تمھارے لیے ایک لفظ کو بول دینا آسان ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے کسی بڑے سے بڑے کام کو کر دینا آسان ہے۔ اس کو کسی کام کے لیے کوئی اہتمام یا سر و سامان نہیں کرنا پڑتا بلکہ وہ ہر کام اپنے کلمہ 'کُنْ' سے چشم زدن میں کر دیتا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ (النحل ۱۶: ۴۰)	جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمارا بس یہ کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔

دوسرے مقام میں ارشاد ہے۔

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَہُمْ ط بَلٰی ق وَہُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۝ اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ (یٰسٓ ۳۶: ۸۱-۸۲)	کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں ہوگی کہ ان کے مثل پیدا کر دے! ہاں، وہ اس بات پر قادر ہے۔ وہ بڑا ہی پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔ اس کی قدرت کا حال تو یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

بعض مقامات میں یہ بات بھی واضح فرمائی ہے کہ اس دنیا کو دوبارہ پیدا کر دینا تو اس کے لیے اول بار پیدا کرنے سے بھی زیادہ آسان ہے۔

وَہُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ وَہُوَ اَہْوَنُ	اور وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے اس سے بھی

عَلَیْہِ ط (الروم: ۲۷) آسان ہے۔

یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھیے کہ یہ تمثیل بھی ہمارے سمجھانے کے لیے محض ایک تمثیل ہے ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لیے ایک لفظ کو بولنا بھی اتنا آسان نہیں ہے جتنا اللہ تعالیٰ کے لیے سارے جہان کو پیدا کر دینا۔ ہم ایک لفظ بولنے کے لیے نہ جانے کتنے ادوات و آلات کے محتاج ہیں جو سب کے سب خدا کے بخشے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی چیز کا بھی محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن میں بعض جگہ کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ' پلک جھپکنے کی تمثیل بھی آئی ہے۔ 'وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ' (القمر: ۵۰) (ہمارا حکم تو بس پلک جھپکنے کی طرح ہے)۔ یہ بھی ایک تمثیل ہی ہے، جس سے ہمیں اس کے اختیار مطلق کا ایک تصور ہوتا ہے۔ ان تمثیلات و تشبیہات سے متعلق وہ حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھیے جو سورۂ آلِ عمران میں بیان ہوئی ہے۔

استاذ امامؒ کا ایک نکتہ

یہاں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے۔ اوپر زمین، نفس اور آسمان کی جن نشانیوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے ان کے باہمی نظم کی وضاحت اپنی تفسیر میں مولاناؒ نے یوں فرمائی ہے۔[1]

"اس جامع کلام کے اندر جو خوبصورت ترتیب پائی جاتی ہے اور اقرب فالاقرب کا جو اصول اس میں ملحوظ ہے، پچھلے مباحث سے بڑی حد تک اس کی وضاحت ہو گئی ہے لیکن اس پر مزید غور کیجیے تو ایک اور لطیف نکتہ بھی سامنے آئے گا۔"

"اس ٹکڑے میں 'وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ' سے لے کر 'وَمَا تُوْعَدُوْنَ' تک پہلے زمین کا ذکر آیا ہے پھر نفس کا پھر آسمان کا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نفس ایک ایسی چیز ہے جو زمین اور آسمان دونوں کے درمیان ہے اور اس کے اندر دو پہلو ہیں۔ ایک مادی دوسرا روحانی۔ ایک پہلو سے یہ زمین کی طرف رجحان رکھتا ہے، دوسرے پہلو سے آسمان کی طرف۔ اس کے بعد ان تینوں کے اندر جو نشانیاں پائی جاتی ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا۔ پھر فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ (آسمان اور زمین کے رب کی قسم، یہ حق ہے) فرما کر اس جامع دلیل سے پردہ اٹھایا ہے جو انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے اور جزا و سزا کی اصل دلیل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی پروردگاری کی دلیل۔ پھر 'مِثْلَ مَآ اَنَّکُمْ تَنْطِقُوْنَ' (جس طرح تم بولتے ہو) کی تمثیل کے ذریعہ سے اس استدلال کو تقویت پہنچائی ہے اور تمثیل اسی نفس کی صفات سے ماخوذ ہے جو ایک عالم اصغر ہونے کے پہلو سے تمام زمین و آسمان کا ایک آئینہ ہے۔ یہ گویا اوپر والی بات 'وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ' کی طرف اشارہ ہوا۔"

---

[1] تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ

۷۔ آگے آیات ۲۴ - ۴۶ کا مضمون

آگے قرآن نے انہی دعاوی کے حق میں، جو اوپر مذکور ہوئے، تاریخ کی شہادت پیش کی ہے اور قرآن کا یہ عام اصول ہے کہ وہ عقلی و انفسی دلائل کے پہلو بہ پہلو تاریخی شواہد بھی پیش کرتا ہے تاکہ مخاطب کے سامنے بات اچھی طرح مُبرہن بھی ہو جائے اور اگر دلوں کے اندر اثر پذیری کی کچھ رمق ہو تو ان سے لوگ عبرت بھی حاصل کریں۔ ان واقعات پر غور کیجیے گا تو معلوم ہو گا کہ ان میں تین پہلو ملحوظ ہیں۔

— ایک یہ کہ جن قوموں کی ہلاکت بیان ہوئی ہے ان کی تباہی میں ابر و ہوا کے تصرفات کو خاص دخل رہا ہے۔ اس پہلو سے یہ واقعات گویا ان قسموں کی تصدیق ہیں جو اوپر کھائی گئی ہیں۔

— دوسرا یہ کہ ان میں جزا کے دونوں پہلو نمایاں ہوئے ہیں، رحمت بھی اور نقمت بھی۔ ایک ہی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک قوم کے لیے عذاب بن گئی اور دوسری قوم کے لیے ذریعۂ نجات۔

— تیسرا یہ کہ اللہ کی گرفت بالکل بے پناہ ہے۔ کوئی قوم کتنی ہی زور آور ہو لیکن اللہ تعالیٰ جب اس کو فنا کرنا چاہتا ہے تو چشم زدن میں فنا کر دیتا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۴ - ۴۶

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا
فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً
لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ
اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ
اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ
وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾
مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾
وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ
اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا
اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ
مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾

ع ۲۳ / ۱

ترجمہ آیات ۲۴-۴۶

کیا تمھیں ابراہیم کے معزز مہمانوں کی بات پہنچی! جب وہ اس کے پاس آئے
تو انھوں نے السلام علیکم کہا۔ اس نے بھی سلام سے جواب دیا (اور دل میں کہا کہ)
یہ تو اجنبی لوگ معلوم ہوتے ہیں! پھر وہ نظر بچا کر اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ان
کے لیے فربہ بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت لایا اور اس کو ان کے سامنے پیش کیا۔ پھر
بولا کہ آپ لوگ کھاتے نہیں! تو اس نے ان سے ایک قسم کا اندیشہ محسوس کیا۔ انھوں
نے اس سے کہا، تم اندیشہ ناک نہ ہو اور اس کو ایک ذی علم فرزند کی خوش خبری
دی۔ پھر اس کی بیوی حیران ہو کر بڑھی۔ اس نے اپنا ماتھا ٹھونکا اور بولی کہ کیا ایک

بڑھیا، بانجھ اب جنے گی! وہ بولے کہ ایسا ہی فرمایا ہے تیرے رب نے۔ وہ بڑا ہی حکیم وعلیم ہے۔ اس نے پوچھا، اے فرستادو، اس وقت آپ کے سامنے مہم کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ان کے اوپر سنگِ گِل کی بارش کر دیں جو نشان لگائے ہوئے ہیں تیرے رب کے پاس ان لوگوں کے لیے جو حدود سے آگے بڑھ جانے والے ہیں۔ پھر وہاں جتنے اہلِ ایمان تھے ان کو ہم نے نکال لیا۔ تو وہاں ہم نے بجز ایک گھر کے کسی کو مُسلم نہیں پایا اور ہم نے اس میں ایک بڑی نشانی چھوڑی ان لوگوں کے لیے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔ ۳۴-۳۷

اور موسیٰ کی سرگزشت میں بھی نشانی ہے جب کہ ہم نے اس کو فرعون کے پاس بھیجا ایک واضح سند کے ساتھ تو اس نے گھمنڈ کے ساتھ منہ موڑا اور بولا کہ یہ تو ایک جادوگر ہے یا خبطی۔ تو ہم نے اس کو اور اس کی فوج کو پکڑا اور ان کو پھینک دیا سمندر میں۔ اور اس کے لیے وہ خود سزاوارِ ملامت تھا۔ ۳۸-۴۰

اور عاد کی سرگزشت میں بھی نشانی ہے جب کہ ہم نے ان پر بادِ خشک چلادی وہ جس چیز پر سے بھی گزرتی ریزہ ریزہ کر کے چھوڑتی۔ ۴۱-۴۲

اور ثمود کے واقعہ میں بھی عبرت ہے جب کہ ان سے کہا گیا کہ تھوڑی مدت کے لیے اور عیش کر لو۔ تو انھوں نے سرکشی سے اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا تو ان کو پکڑ لیا کڑک نے اور وہ دیکھتے رہے۔ پھر نہ وہ اٹھ ہی سکے اور نہ اپنا بچاؤ ہی کر سکے۔ ۴۳-۴۵

اور قوم نوح کو بھی ہم نے اس سے پہلے پکڑا۔ یہ لوگ بھی نافرمان تھے۔ ۴۶

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ (۲۴)

تاریخی سرگزشتوں سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نقمت کی شہادت

اوپر آیت وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ کے تحت ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں رحمت اور نقمت دونوں ہی ہے۔ وہ ایک ہی چیز کو جس کے لیے چاہے رحمت بنا دے اور اسی چیز کو جس کے لیے چاہے عذاب بنا دے۔ آسمان سے بارش ہوتی ہے جو اہل زمین کے لیے ایک عظیم رحمت ہے لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اس کو عذاب بھی بنا دیتا ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے آگے کی تاریخی سرگزشتوں کی تمہید حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ سے اٹھائی ہے جس میں قوم لوط کے انجام سے پہلے یہ دکھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو فرشتے قوم لوط کے لیے قہر الٰہی لے کر آئے وہی فرشتے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ایک ذی علم فرزند کی بشارت لے کر پہنچے۔

'هَلْ اَتٰىكَ' کا خطاب ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو بلکہ اقرب یہ ہے کہ یہ خطاب انہی مکذبین سے ہے جن پر اس سورہ میں حجت تمام کی جا رہی ہے۔ جماعت کو جب واحد کے صیغہ سے خطاب ہوتا ہے تو، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں، مخاطب گروہ کے ایک ایک فرد کو متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ استفہامیہ اسلوب بیان بھی بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ آگے جو بات کہی جا رہی ہے وہ اہمیت رکھنے والی ہے، اس کو ہر شخص سنے اور گوش دل سے سنے۔

لفظ 'ضَيْف' واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ یہاں اس کی صفت 'مُكْرَمِيْنَ' آئی ہے۔ لفظ 'مکرمین' سے اشارہ اس آؤ بھگت، خیر مقدم، تواضع اور ضیافت کی طرف ہے جس کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان مہمانوں کے لیے فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ ان مہمانوں کی شرافت و وجاہت ان کی شکل و صورت ہی سے ظاہر تھی۔ اس کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے ناآشنا ہونے کے باوجود ان کی ضیافت کی تیاریوں میں لگ گئے اور انتہائی عجلت میں جو بہتر سے بہتر سامانِ ضیافت ممکن تھا، وہ انھوں نے کر ڈالا۔ لیکن یہی مہمان جب حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تو ان کی قوم ان مہمانوں کی بے حرمتی کے درپے ہو گئی اور حضرت لوط علیہ السلام کو اپنے مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے خود اپنی حرمت

داؤ پر لگا دینی پڑی۔ بالآخر ان مہمانوں کو اپنا اصلی رُخ ان ناہنجاروں کے لیے بے نقاب کرنا پڑا اور انھوں نے اس پوری قوم کا بیڑا غرق کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پاس آنے والے مہمان

اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْہِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ط قَالَ سَلٰمٌ ج قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ (۲۵)

یعنی ان مہمانوں نے شرفاء اور صالحین کے طریقہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ان کا جواب سلام سے دیا۔ ان کے اس سلام سے اجنبیت کا پردہ تو ایک حد تک اٹھ گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ اطمینان ہو گیا کہ شریف اور صالح مہمان ہیں لیکن ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کس مقصد سے آئے ہیں؟ یہ تو بالکل اجنبی لوگ ہیں!

'قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ' کے الفاظ انھوں نے زبان سے نہیں بلکہ اپنے دل میں کہے۔ دل میں سوال پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوئی ہو گی کہ اس علاقے میں اوّل تو شرفاء و صالحین کی تعداد تھی ہی نہایت محدود، پھر جو تھے بھی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلقین و متوسلین ہی میں سے تھے اس وجہ سے ان کو نہایت حیرت ہوئی کہ اس قحط الرجال میں، اس دیار میں، ایسے ثقہ و شریف لوگ کہاں سے نکل آئے!

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ لفظ 'قول' جس طرح زبان سے کہی ہوئی بات کے لیے آتا ہے اسی طرح دل میں کہی ہوئی بات کے لیے بھی آتا ہے۔ اس کی مثالیں کلام عرب میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی موجود ہیں، جن میں سے بعض پیچھے گزر چکی ہیں اور بعض آگے آئیں گی۔ مہمانوں کے سلام کا جواب تو انھوں نے تو لا دیا لیکن یہ بات انھوں نے دل میں کہی۔ اس لیے کہ یہ بات زبان سے کہنے کی نہیں تھی۔

فَرَاغَ اِلٰٓی اَھْلِہٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ (۲۶)

لفظ 'روغ' کسی کام کو نظر بچا کر اور کاوا لگا کر کرنے کے لیے آتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ مہمانوں کو دیکھتے ہی، ان کی نظر بچا کر، اپنے گھر کی طرف گئے کہ ان کی ضیافت کا سامان کریں۔ مہمانوں کی نظر بچا کر اس لیے کہ انھوں نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ ان کا یہ اہتمام مہمانوں کی طبیعت پر بار ہو۔ کریم النفس، شریف اور فیاض میزبان کی میزبانی کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ وہ مہمان کی ضیافت کا اہتمام اس طرح کرتا ہے کہ اس کو تکلف کا احساس نہ ہو۔

'فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ' یعنی ان مہمانوں کی ضیافت کے لیے انھوں نے گلّے کا ایک فربہ بچھڑا ذبح کرا دیا اور اس کا بھنا ہوا گوشت ان کے آگے پیش کیا۔ 'عِجْلٍ سَمِیْنٍ' کے الفاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فیاضی کا اظہار ہوتا ہے کہ انھوں نے چند مہمانوں کی ضیافت کے

لیے ایک پورا بچھڑا ذبح کرا دیا۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ انھوں نے پورا بچھڑا مہمانوں کے آگے پیش کر دیا ہو۔ بعض اوقات کُل بول کر اس سے جزء مراد لیتے ہیں۔ یہ اسلوب جس طرح ہر زبان میں ہے اسی طرح عربی میں بھی ہے۔

فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ (۲۷)

حضرت ابراہیمؑ کا ایک اندیشہ

اس جملہ میں کچھ حذف ہے جس پر قرینہ دلیل ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ سامانِ ضیافت ان کے سامنے پیش کیا لیکن جب دیکھا کہ مہمان کھانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھا رہے ہیں تب انھوں نے نہایت محبت کے ساتھ ان کو کھانے کی دعوت دی۔ بعض دوسرے مقامات میں قرآن نے اس حذف کو کھول بھی دیا ہے۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (۲۸)

یعنی جب مہمانوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو قدرتی طور پر وہ اجنبیت کچھ اور بڑھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باوّلِ وہلہ محسوس فرمائی تھی اور انھوں نے اپنے دل کے اندر ایک اندیشہ محسوس کیا۔ سورۂ ہود میں اشارہ موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندر اندیشہ ضیافت قبول نہ کرنے کے سبب سے پیدا ہوا: فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً (ھود: ۷۰) (جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں تو اس نے ان کو بیگانہ محسوس کیا اور ان سے دل ہی دل میں ڈرا)۔

معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ یہ لوگ بشر نہیں ہیں، جیسا کہ انھوں نے گمان کیا ہے، بلکہ فرشتے ہیں۔ فرشتوں کا کھانا نہ کھانا ایک معروف بات ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے مخفی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ان کے علم میں یہ بات بھی رہی ہوگی کہ فرشتے جب آتے ہیں تو کسی بڑی مہم ہی پر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں پاس ہی قومِ لوط کا فسادِ اخلاق اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا جس کے سبب سے وہ ہر وقت خدا کے عذاب کی زد میں تھی۔ ان حالات و قرائن کی موجودگی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہونا کچھ بعید نہیں تھا کہ شاید اب قومِ لوط کی شامت آگئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تردد کو فرشتوں نے تاڑ لیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ آپ کوئی اندیشہ نہ کریں اور مزید اطمینان پیدا کرنے کے لیے ان کو ایک ذی علم فرزند کی خوشخبری بھی دی۔ یہ ایک بہت بڑی خوش خبری تھی اس لیے کہ یہ مجرد فرزند کی نہیں بلکہ ذی علم فرزند کی خوش خبری تھی جس کے اندر یہ بشارت بھی مضمر تھی کہ یہ فرزند صاحب نبوت ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ خوش خبری پاکر خود اپنے باب میں تو مطمئن ہو گئے لیکن

فرشتوں کی مہم کے باب میں ان کے ذہن میں سوال باقی رہا جس کا اظہار انھوں نے بعد میں کیا جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ (۲۹)

فرزند کی خوشخبری پر حضرت سارہ کے تاثرات

یہ بشارت، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلند آواز سے دی گئی تھی اس وجہ سے ان کی بیوی سارہ نے، جو پاس ہی کھڑی تھیں، سن لی۔ اس سے ان کو جو حیرت اور ساتھ ہی جو خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے! چنانچہ وہ یہ سنتے ہی اپنے تعجب کے اظہار کے لیے لپکیں اور خاص نسوانی انداز میں اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں کہ میں تو ایک بڑھیا بانجھ ہوں، کیا اب اس عمر اور اس حالت میں میں جنوں گی! حضرت سارہ کے اس فقرے کے ایک ایک لفظ کے اندر جو حیرت، جو خوشی اور اس کی بشارت کی تصدیق مزید کی جو خواہش جھلک رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

'فِيْ صَرَّةٍ' یعنی وہ تعجب اور حیرانی کی حالت میں لپکیں۔ عربی میں محاورہ ہے: 'صَرَّ الفرسُ اذنیہ' گھوڑے نے اپنی کنوتیاں کھڑی کیں۔ اسی سے 'فِيْ صَرَّةٍ' کا محاورہ نکلا ہے جو تعجب اور حیرانی کی حالت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔

'فَصَكَّتْ وَجْهَهَا' یعنی انھوں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ یہ عورتوں کے اظہار تعجب کا طریقہ ہے۔ جب وہ کسی بات پر حیرت کا اظہار کرتی ہیں تو پیشانی پر ہاتھ مار کر بات کہتی ہیں۔ ان دو لفظوں میں قرآن نے ان کی حیرت اور خوشی کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ (۳۰)

فرشتوں کی اطمینان دہانی

فرشتوں نے جواب دیا کہ آپ مطمئن رہیں۔ آپ کے رب نے ایسا ہی حکم دیا ہے اور جب اس نے حکم دیا ہے تو یہ بات پوری ہو کے رہے گی۔ نہ آپ کا بڑھیا بانجھ ہونا اس میں مانع ہوگا اور نہ آپ کے شوہر کا بڑھاپا۔ اللہ تعالیٰ حکیم و علیم ہے۔ اس کی حکمت اور اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اسباب اسی کے پیدا کیے ہوئے اور اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ جب چاہے گا ان کو آپ کے لیے سازگار کر دے گا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۳۱)

حضرت ابراہیم کا سوال اور اس کی نوعیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اپنے باب میں اطمینان ہو گیا اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ لوگ فرشتے ہیں تو انھوں نے ان سے سوال کیا کہ اے فرستادو! اس وقت آپ لوگوں کے سامنے مہم کیا ہے؟ یہ سوال انھوں نے اس وجہ سے کیا کہ ان پر یہ حقیقت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، واضح تھی کہ فرشتے جب اس طرح آتے ہیں تو کسی بڑی مہم ہی پر آتے ہیں۔ مجرد فرزند کی

خوش خبری مقصود ہوتی تو اس کے لیے اس اہتمام کی ضرورت نہیں تھی۔ لفظ 'خَطْبٌ' عربی میں کسی بڑے اور اہم کام ہی کے لیے آتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں چونکہ قوم لوط سے متعلق اندیشہ موجود تھا اس وجہ سے انھوں نے چاہا کہ اگر یہی مہم ہے تو بات واضح ہو جائے۔ خاص طور پر ان کو حضرت لوط علیہ السلام، ان کے اہل بیت اور ان کے ساتھیوں کی بڑی فکر تھی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں تفصیل بھی موجود ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات واضح ہوئی کہ قوم لوط پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے تو انھوں نے قوم لوط کے اہل ایمان کے باب میں اپنے رب سے بڑا مجادلہ کیا۔ اس مجادلہ کی اللہ تعالیٰ نے بڑی تعریف فرمائی ہے اور اس کو حضرت ابراہیم کی دردمندی کی شہادت میں پیش کیا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ (۳۲)

فرشتوں کا جواب

فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم مجرموں کی ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے قوم لوط کا ذکر نام کی تصریح کے ساتھ نہیں کیا لیکن سورۂ ہود میں ہے: 'قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ' (ھود: ۷۰) (انھوں نے کہا تم نہ ڈرو، ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں) ان دونوں مواقع کو ملانے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرشتوں نے قوم لوط کا ذکر ان کے کردار اور نام دونوں کے ساتھ کیا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس قوم کے مستحق عذاب ہونے کا پہلو واضح ہو جائے لیکن قرآن نے بہ تقاضائے بلاغت اس سورہ میں ان کے نام کا ذکر حذف کر کے صرف ان کے قوم مجرم ہونے کا ذکر کیا ہے تاکہ یہ پہلو واضح ہو سکے کہ قوم لوط کو جس عذاب سے دوچار ہونا پڑا اپنے عمل کی پاداش میں ہونا پڑا۔ یہ امر واضح رہے کہ یہی بات اس سورہ کا عمود ہے۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۙ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ (۳۳-۳۴)

یہ فرشتوں نے اپنے بھیجے جانے کا مقصد واضح فرمایا کہ ہم بھیجے گئے ہیں کہ اس مجرم قوم پر کنکروں کی بارش کر دیں۔ یہاں 'علیٰ' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان پر ایسی بارش کریں کہ بالکل پامال کر کے رکھ دیں۔

'حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ' سے مراد وہ کنکر ہیں جو مٹی سے پتھر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے قرآن میں لفظ 'سجّیل' بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں 'وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ' (ھود: ۸۲) (اور ہم نے اس پر سنگ گل کی بارش کر دی)۔ 'سِجِّيْل' دراصل فارسی کے سنگ گل سے معرب ہے۔ یہاں 'حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ' کے الفاظ سے اس کی وضاحت فرما دی ہے۔

'مُسَوَّمَةً' کے معنی نشان زدہ کے ہیں۔ یہ لفظ میرے نزدیک 'حجارۃ' سے حال پڑا ہوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں یہ پتھر نشان لگا کر قوم لوط کے اشرار کے لیے خاص کیے ہوئے ہیں۔ جن علاقو

میں لشکروں کی تعمیر کنکروں سے ہوتی ہے وہاں دیکھا ہوگا کہ مزدوران کے چھٹے لگا کر ان پر نشان بھی لگا دیتے ہیں جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ بحق سرکار محفوظ ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ وقت کے وقت اتنے پتھر کہاں ملیں گے جو پوری قوم کی قوم کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہوں۔ ان کے چھٹے پہلے سے لگے ہوئے ہیں اور ان پر خدائی نشان بھی لگے ہوئے ہیں کہ یہ کارِ خاص کے لیے محفوظ ہیں، کوئی ان کو ہاتھ نہ لگائے۔ سورۂ ہود میں یہ تصریح بھی ہے کہ وَمَا ہِیَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ بِبَعِیۡدٍ (ھود: ۸۳) (اور یہ پتھر ان ظالموں سے کچھ دُور بھی نہیں ہیں) یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس زمین پر وہ چلتے پھرتے ہیں وہیں سے بلکہ ان کے قدموں کے نیچے سے خدا کی مامور باد تند اس کو اٹھائے گی اور ان کے اوپر اس کی بارش کر دے گی۔

'لِلۡمُسۡرِفِیۡنَ' سے اشارہ قومِ لُوط کے اشرار کی طرف ہے۔ 'اسراف' کے معنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے تجاوز کے لیے آیا ہے۔ یہاں اس سے مراد قومِ لوط کی وہ بے حیائی ہے جس میں وہ من حیث القوم مبتلا تھی۔ جو قوم اللہ تعالیٰ کے حدود کے معاملے میں دیدہ دلیری کی یہ روش اختیار کر لیتی ہے اللہ تعالیٰ اس کی سرکوبی کے لیے اپنی مسخر کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کو چاہتا ہے ڈھیل چھوڑ دیتا ہے اور وہ اس کے طغیان و اسراف کا اس کو مزا چکھا دیتی ہے۔

فَاَخۡرَجۡنَا مَنۡ کَانَ فِیۡہَا مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿ۚ﴾ فَمَا وَجَدۡنَا فِیۡہَا غَیۡرَ بَیۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿ۚ﴾ وَ تَرَکۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیَۃً لِّلَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ (۳۵-۳۷)

قومِ لُوط کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

فرشتوں کی بات اوپر کی آیت پر ختم ہوئی۔ اب یہ آگے کی سرگزشت خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کہ اس کے بعد اس نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ فرمایا کہ عذاب نازل کرنے سے پہلے ہم نے اس بستی کے اندر سے ان لوگوں کو نکال لیا جو اہلِ ایمان تھے۔ 'فِیۡہَا' میں ضمیر کا مرجع قومِ لوط کی بستی ہے۔ چونکہ یہ مثالیں 'وَ فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ' کے تحت بیان ہو رہی ہیں اس وجہ سے ضمیر بغیر مرجع کے آگئی۔ قرینہ کی موجودگی میں اس طرح ضمیر کا آنا عربی زبان میں معروف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کا ذکر اس کتاب میں بار بار ہو چکا ہے کہ رسول کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کے بعد جب کسی قوم پر فیصلہ کن عذاب آیا ہے تو اس سے وہ لوگ بچا لیے گئے ہیں جو ظہورِ عذاب سے پہلے رسول پر ایمان لا چکے تھے۔ یہ سنتِ الٰہی تمام رسولوں کی سرگزشتوں میں واضح فرمائی گئی ہے۔ قومِ لوط کے باب میں دوسری جگہ تصریح ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے آل و اتباع کو ہدایت ہوئی کہ وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے ان حدود سے باہر نکل جائیں۔

جن کے لیے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس طرح باہر نکلیں کہ کوئی پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھے۔

'فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ'۔ یعنی اس بستی میں ایک گھرانے کے سوا اور کوئی گھر مسلمانوں کا نہیں ملا۔ ظاہر ہے کہ یہ گھرانا حضرت لوط علیہ السلام ہی کا تھا اور اس کے اندر سے بھی، قرآن میں تصریح ہے کہ، ان کی بیوی الگ کر دی گئی اس لیے کہ اس کی ساری ہمدردیاں حضرت لوط علیہ السلام کے بجائے اپنی قوم ہی کے ساتھ تھیں۔

قومِ لوط کے اندر اہلِ ایمان کی اس کمی کی طرف، خاص اہتمام کے ساتھ، قرآن نے جو اشارہ کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ کن عذاب کسی قوم پر اس وقت نازل فرماتا ہے جب پوری قوم کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے۔ اہلِ ایمان اس کے اندر یا تو بالکل معدوم ہو جاتے ہیں یا ان کی تعداد اتنی قلیل ہوتی ہے کہ وہ معدوم ہی کے حکم میں ہوتے ہیں۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو مجادلہ قومِ لوط کے بارے میں منقول ہے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات عدل و رحمت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

ایک قابلِ توجہ بات

ایک خاص بات یہاں اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اوپر والی آیت میں لفظ 'مُؤْمِنِينَ' استعمال ہوا ہے اور آیت زیرِ بحث میں 'مُسْلِمِينَ' ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اوپر والی آیت میں نجات کے باب میں سنتِ الٰہی بیان ہوئی ہے اور سنتِ الٰہی یہی ہے کہ عذاب سے نجات صرف سچے اہلِ ایمان ہی پاتے ہیں۔ اس دوسری آیت میں علاقے کا حال بیان ہوا ہے کہ ایک خاندان کے سوا وہاں مسلمانوں کا کوئی گھرانا سرے سے تھا ہی نہیں۔ اس گھرانے کے لیے لفظ 'مُسْلِمِينَ' استعمال فرمایا جس میں وسعت ہے۔ اس کے اندر پختہ اور خام، بالغ اور نابالغ سب سما سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ظاہری اعتبار سے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اس میں شامل تھی لیکن آخری وقت میں وہ اس سے خارج کر دی گئی۔

زمین کے بعض آثارِ عذاب

'وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ'۔ یعنی قومِ لوط کی بستی میں ہم نے ایک نہایت واضح نشانی ان لوگوں کی عبرت پذیری کے لیے چھوڑی جو اللہ کی زمین میں اس کے قہر و غضب کی نشانیاں دیکھنا اور ان سے سبق حاصل کرنا چاہیں۔ یہاں اوپر کی آیت 'وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ' (اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں) کو پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ یہ اسی دعوے کی شہادت زمین کے ان آثار سے پیش کی گئی ہے جو قریش سے مخفی نہیں تھے۔ ہم سورۂ حجر کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ قومِ لوط کے مساکن ــــ سدوم اور عمورہ ــــ حجاز اور شام کی گزرگاہ پر تھے جس سے قریش کے تجارتی قافلے برابر گزرتے رہتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان آثار کو دیکھتے ہوئے وہ پیغمبر کے انذار کی تکذیب کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ لوگ

اسی وقت مانیں گے جب یہ طوفان بلاخیز ان کے سروں پر سے گزر جائے گا۔

اس سنگباری کی نوعیت جو قوم لوط پر ہوئی

اب یہاں مختصر طور پر اس سنگ باری کی نوعیت بھی سمجھ لیجیے جس کا ذکر آیت ۳۳ میں ہوا ہے تاکہ سورہ کی تمہید میں غبار انگیز ہواؤں اور دھاریوں والے بادلوں کی جو قسم کھائی گئی ہے، اس کے ساتھ اس سرگزشت کا ربط واضح ہو جائے۔

استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں اس عذاب کی نوعیت پر مفصل بحث کر کے خلاصۂ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

> "قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر حاصب (کنکر برسانے والی باد تند) بن گئی جس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں اور پتھروں کی بارش ہوئی پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ قوم لوط ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: "فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا" (العنکبوت: ۴۰) (اور ان مکذبین میں وہ بھی ہیں جن پر ہم نے کنکر برسانے والی باد تند چلا دی) نیز انہی کے بارے میں فرمایا ہے کہ "فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ" (الحجر: ۷۴) (پس ہم نے اس بستی کو بالکل تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گل کی قسم کے پتھروں کی بارش کی) یعنی ایسی تند ہوا چلی کہ ان کے مکانات اور چھتیں سب زمین بوس ہو گئیں اور اوپر سے کنکروں اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا، جیسا کہ فرمایا ہے: "وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ ۝ فَغَشَّاهَا مَا غَشَّىٰ" (النجم: ۵۳-۵۴) (اور الٹی ہوئی بستیاں جن کو الٹ دیا، پھر ان کو ڈھانک دیا جس چیز سے ڈھانک دیا)"۔

آخر میں قوم لوط کے عذاب سے متعلق تورات کے بیان پر تنقید کر کے خلاصہ بحث مولانا فراہیؒ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

> "اس سے معلوم ہوا کہ قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے سنگ ریزے برسانے والی آندھی کا عذاب بھیجا جس نے ان کو اور ان کے مکانوں کو ڈھانک لیا۔ اگر اس کے ساتھ تورات کا بیان بھی ملا لیا جائے تو مزید یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ان کے اوپر حاصب کے ساتھ رعد و برق کا عذاب بھی آیا"۔

اس تفصیل کی روشنی میں غور کیجیے تو قوم لوط کی سرگزشت میں ان دونوں قسموں کی شہادت موجود ہے جو اوپر کھائی گئی ہیں۔ یعنی غبار انگیز ہوا کے تصرفات کو بھی اس میں دخل ہے اور سرملے کے بھاری والے بادلوں کو بھی۔

قوم لوط کا واقعہ سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں بھی زیر بحث آیا ہے۔ اگر مزید تفصیل مطلوب ہو تو

ان سورتوں کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ ان شاء اللہ بحث کا ہر گوشہ صاف ہو جائے گا۔

وَفِیْ مُوْسٰٓی اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۳۸)

حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت کی طرف اشارہ

اس کا عطف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت پر ہے۔ یعنی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کے عدل و انتقام کی نشانیاں ہیں اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت میں بھی اس کی نشانیاں موجود ہیں۔

لفظ 'سُلْطٰنٌ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ لفظ واضح سند کے معنی میں بھی قرآن میں آیا ہے اور رعب و دبدبہ کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ ان دونوں معنوں پر حاوی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو نشانیاں عطا فرمائیں ان کے خدائی سند ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ فرعون نے محض استکبار کے سبب سے ان کو سحر قرار دیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معجزات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو دیکھ کر فرعون اور اس کے اعیان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایسا رعب جم گیا کہ انتہائی جوشِ انتقام کے باوجود وہ آخر وقت تک ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے۔

فَتَوَلّٰی بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۳۹)

'رُكْنٌ' کے معنی مونڈھے کے ہیں اور 'ب' سے یہاں تعدّی کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے۔ جب کوئی شخص کسی چیز سے تکبّر کے ساتھ اعراض کرتا ہے تو شانے اور مونڈھے جھٹک کر منہ پھیرتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی ہوں گے کہ اس نے غرور کے ساتھ منہ پھیرا۔ قرآن میں یہ اسلوب جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

وَاِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ (بنی اسرآئیل: ۸۳)

اور جب ہم انسان پر اپنا فضل کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور گھمنڈ سے منہ موڑتا ہے۔

سورۂ حج آیت ۹ میں اسی متکبرانہ اعراض کی تعبیر 'ثَانِیَ عِطْفِهٖ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔

'وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ' یعنی کبھی ان کو ساحر کہہ کر ان کی تکذیب کی اور کبھی ان کو خبطی ٹھہرایا۔ جب ان کے معجزے دیکھے تو کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے اور جب ان کی دعوت سنی تو کہا کہ یہ شخص خبطی ہے جو ایک ایسے خدا کا رسول ہونے کا مدّعی ہے جس کی شکل کسی نے نہیں دیکھی۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ وَهُوَ مُلِیْمٌ (۴۰)

یعنی تب ہم نے اس کو اور اس کی فوجوں کو پکڑا اور ان کو سمندر میں پھینک دیا۔ یہاں فوجوں کا ذکر اس کے سرمایۂ غرور کی حیثیت سے ہوا ہے، اس لیے کہ انہی کا اعتماد اس کے استکبار کا اصل سبب تھا۔ فرعون اور اس کی فوجوں کے غرق ہونے کی جو شکل ہوئی اس کا ذکر پچھلی سورتوں

میں ہو چکا ہے۔ وہی بات یہاں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے کہ گویا ان کی حیثیت خاک اور راکھ کی ایک مٹھی سے زیادہ نہیں تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بے پناہی کی تعبیر ہے کہ بڑے سے بڑے متکبر کا سارا سرمایۂ غرور اس کی قدرت کے آگے ایک مشتِ خس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

وَهُوَ مُلِيمٌ، یعنی اس انجام کے لیے سزاوار ملامت وہ خود ہی تھا، کسی دوسرے پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے سے اس کو نیک و بد سے اچھی طرح آگاہ کر دیا لیکن غرور نے اس کو عقل و ہوش سے اس طرح عاری کر دیا تھا کہ وہ کسی طرح سوچنے سمجھنے پر آمادہ نہیں ہوا اور اپنی پوری قوم کو اس نے ہلاکت کے گھاٹ پر لے جا اتارا۔

یہاں فرعون اور اس کی فوجوں کے غرق ہونے کے واقعہ کی نوعیت واضح نہیں فرمائی لیکن قرآن کے دوسرے مقامات اور تورات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی تباہی میں بھی اصل دخل ہوا کے تصرفات ہی کو تھا۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں اس واقعہ پر بحث کرنے کے بعد خلاصۂ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کی نوعیت

"اس واقعہ میں ہوا کے عجیب و غریب تصرفات کو جو دخل ہے اور جس کی طرف قرآن نے سرسری اشارہ کیا ہے، تورات کی سفر خروج میں اس کی نوعیت یہ بیان کی گئی ہے۔"

"پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا" (خروج: باب ۱۴-۲۱)

"یہ پوربی آندھی رات بھر چلتی رہی اور صبح کو تھم گئی۔ ہوا کے زور سے سمندر کا پانی مغرب کی طرف خلیج سویز میں ڈال دیا اور مشرقی خلیج، خلیج عقبہ کو بالکل خشک چھوڑ دیا۔ پھر جب آندھی تھم گئی تو پانی اپنی جگہ پر پھیل گیا اور موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرنے والی فوج غرق ہو گئی۔ اس کی تصدیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ سورۂ دخان میں ہے:۔

فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ ۝ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُندٌ مُّغْرَقُونَ ۝ (الدخان: ۲۳-۲۴)	اور میرے بندوں کو راتوں رات نکال لے جاؤ اور آگاہ رہو کہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا اور سمندر کو ساکن چھوڑ دو۔ بے شک ان کی فوج غرق ہونے والی فوج ہو گی۔"

"وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا میں رَهْو کے معنی سکون کے ہیں اور دریا کا سکون ظاہر ہے کہ ہوا کے سکون ہی سے ہوتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے:۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ ۝	"اور ہم نے موسیٰ کو ہدایت کی، میرے بندوں کو

اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡ فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخۡشٰی ۝ فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ بِجُنُوۡدِهٖ فَغَشِیَهُمۡ مِّنَ الۡیَمِّ مَا غَشِیَهُمۡ ۝ (طٰهٰ: ۷۷-۷۸)

راتوں رات نکال لے جاؤ اور ان کے لیے راہ نکالو، سمندر میں خشک۔ نہ تم کو پکڑے جانے کا خوف ہوگا نہ ڈوبنے کا اندیشہ تو فرعون نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا تو سمندر میں سے ان کے اوپر چھا گئی جو چیز چھا گئی۔"

"سفر خروج: باب ۱۵-۱۰ میں حضرت موسیٰ کا ترانۂ حمد یوں نقل ہوا ہے۔

"تو نے اپنی آندھی کو پھونک ماری تو سمند ر نے ان کو چھپا لیا۔"

"سفر استثناء: باب ۱۱-۴ میں ہے"

"اور اس نے مصر کے لشکر اور ان کے گھوڑوں اور رتھوں کا کیا حال کیا اور کیسے اس نے بحرِ قلزم کے پانی میں ان کو غرق کیا جب وہ تمہارا پیچھا کر رہے تھے اور خداوند نے ان کو کیسا ہلاک کیا کہ آج کے دن تک وہ نابود ہیں۔"

"خلاصہ اس ساری تفصیل کا یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو تند ہوا کے ذریعے سے نجات بخشی اور فرعون اور اس کی فوجوں کو نرم ہوا کے ذریعے سے ہلاک کیا یعنی رحمت اور عذاب دونوں کے کرشمے ہوا ہی کے عجیب تصرفات سے ظاہر ہوئے۔"[1]

سورہ کے آغاز میں ہواؤں کی گردش سے جزاء و سزا پر جو شہادت پیش کی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بھی اس کی ایک نہایت واضح مثال ہے اور یہ بھی منجملہ ان نشانیوں کے ہے جن کی طرف آیت 'وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ' میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَفِیۡ عَادٍ اِذۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمُ الرِّیۡحَ الۡعَقِیۡمَ (۴۱)

قوم عاد کے انجام کی طرف اشارہ

یہ قوم عاد کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان کی سرگزشت میں بھی عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے بڑا سامان موجود ہے جب کہ ہم نے ان کے اوپر ایک باد خشک مسلط کر دی۔ 'الریح العقیم' وہ ہوا جو بالکل بے فیض ہو، جو نہ بارش لائے نہ کوئی اور نفع پہنچائے۔ عربی میں بارش لانے والی ہواؤں کو 'لواقح' (بار آور) کہتے ہیں اور بے فیض و مضر ہواؤں کے لیے 'عقیم' (بانجھ) کی صفت آتی ہے۔ مراد اس سے سرما کی ٹھنڈی اور خشک ہوا ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے 'فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ رِیۡحًا صَرۡصَرًا فِیۡۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ' (حٰمٓ السجدۃ: ۱۶) (پس ہم نے ان کے اوپر ہوائے تند مسلط کر دی نحوست (سرما) کے دنوں میں)۔

---

[1] تفسیر سورۂ ذاریات فراہی۔

مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ کَالرَّمِیْمِ (۴۲)

یہ اس ہوا کی ہلاکت انگیزی کی تصویر ہے کہ جس چیز پر بھی اس کا گزر ہوا اس کو اس نے ریزہ ریزہ کر چھوڑا۔ 'رمیم' لکڑی، رسی اور ہڈی وغیرہ کے بوسیدہ ٹکڑوں اور ریزوں کو کہتے ہیں۔ سرد ہوا کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنی ٹھنڈک اور خشکی کے سبب سے اشیاء کی قوت اور ان کی تازگی و زندگی ختم کر دیتی ہے اور وہ غیر معمولی طور پر تند بھی ہو تو فصلوں، نباتات اور تمام زندہ چیزوں کو توڑ پھوڑ کر بالکل خس و خاشاک کے مانند بنا دیتی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ یہی بات یوں بیان ہوئی ہے:
اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ تَنْزِعُ النَّاسَ کَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (القمر: ۱۹-۲۰) (ہم نے ان کے اوپر بادِ صرصر مسلط کر دی، قائم رہنے والی نحوست کے زمانے میں جو لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی گویا وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنوں کے کندے ہوں)۔

وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ ○ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ (۴۳-۴۴)

قوم ثمود کے انجام کی طرف اشارہ

عاد کے بعد یہ ثمود کے انجام کی یاد دہانی ہے۔ فرمایا کہ ان کی سرگزشت میں بھی عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے سامانِ عبرت موجود ہے۔ 'اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ' یہ خاص طور پر اس وقت کی یاد دہانی فرمائی ہے جب ان کے سرکش لیڈر نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور ان کے رسول حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو آخری تنبیہ فرمائی ہے کہ بس کچھ دیر اور اس دنیا کے عیش سے بہرہ مند ہو لو، اب تمھاری ہلاکت کی گھڑی سر پر آگئی ہے۔ اس آیت میں جو بات 'حَتّٰی حِیْنٍ' کے مجمل الفاظ میں فرمائی گئی ہے سورۂ ہود میں اس کی وضاحت یوں ہوئی ہے: فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِکُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ط ذٰلِکَ وَعْدٌ غَیْرُ مَکْذُوْبٍ (ھود: ۶۵) (تو انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو اس نے کہا کہ اپنے گھروں میں تین دن اور رکھا بس لو۔ یہ دھمکی جھوٹی نہ ہوگی) اس سے معلوم ہوا کہ اونٹنی کے واقعہ کے بعد ان کو آخری دھمکی کے ساتھ تین دن کی مہلت اور ملی کہ اب بھی وہ چاہیں تو توبہ کر کے اپنے کو اس عذاب سے بچا لیں۔

'فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ'۔ 'عتو' کے معنی گھمنڈ اور نافرمانی کرنے کے ہیں۔ جب اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آئے تو اس کے اندر اعراض کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اس آخری مہلت اور اس آخری تنبیہ کی بھی کوئی پروا نہ کی بلکہ نہایت تکبر کے ساتھ اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو خدا کی ڈانٹ نے پکڑ لیا اور وہ دیکھتے رہ گئے۔

'صٰعِقَةُ' کے معنی ڈانٹ اور چیخ کے ہیں اور اس سے مراد وہ عذاب ہے جو ان کی سرکشی کی پاداش

میں ان پر آیا۔ سورۂ ہود میں ان کی سرگزشت جو بیان ہوئی ہے اس میں لفظ 'صَیْحَۃٌ' آیا ہے جس کے معنی ڈانٹ کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ڈانٹ ان کے لیے کس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

'وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ' میں کئی باتیں پوشیدہ ہیں۔

ایک یہ کہ یہ عذاب کھلم کھلا، ڈنکے کی چوٹ آیا، یہ لوگ اس کو دیکھتے رہے لیکن اپنا کوئی بچاؤ نہ کر سکے۔

دوسری یہ کہ عذاب دفعتہً ان پر آدھمکا جس کے بعد ان کو ایک لمحہ کی بھی فرصت نہ مل سکی۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے 'اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً فَکَانُوْا کَھَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ' (القمر: ۳۱) (ہم نے ان کے اوپر ایک ہی ڈانٹ بھیجی تو وہ باڑے والے کے باڑے کی خشک اور ریزہ ریزہ لکڑیوں کے مانند ہو کے رہ گئے)۔

تیسری یہ کہ یہ اس کو دیکھ کر بالکل سراسیمہ ہو کے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کریں۔ آگے کے ٹکڑے میں اس کی وضاحت آرہی ہے۔

فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّمَا کَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ (۴۵)

یعنی جب انھوں نے کڑک سنی تو ان پر دہشت اور کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ کھڑے نہ رہ سکے بلکہ زمین پر گر پڑے۔ سورۂ اعراف میں ان کا حال یوں بیان ہوا ہے: 'فَاَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ' (الاعراف: ۹۱) (پس ان کو کپکپی نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے)۔

'وَمَا کَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ'۔ 'انتصار' کے معنی مدافعت کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ اللہ کے عذاب سے اپنی مدافعت کرنے والے نہ بن سکے۔ اس معنی میں یہ لفظ معروف ہے۔ امرؤالقیس کا شعر ہے۔

فانشب اظفارہ فی المنسا　　فقلت ھُبلت الا تنتصر

(کتے نے اس نیل گاؤ کی ران میں اپنے پنجے گاڑ دیے۔ تب میں نے اس سے کہا، کم بخت! اب تو اپنا بچاؤ کر!)

یہاں تھوڑی دیر توقف کر کے عاد اور ثمود کے عذاب کی نوعیت بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے تاکہ ابتدائے سورہ کی قسموں کے ساتھ ان سرگزشتوں کا تعلق بھی اچھی طرح واضح ہو جائے۔ استاذ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر سورۂ ذاریات میں ان کے عذاب کی یہ شکل بیان فرمائی ہے۔

عاد اور ثمود کے عذاب کی نوعیت

"قرآن مجید میں قوم عاد کی ہلاکت کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے اس پر جو شخص بھی غور کرے گا اس سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہے گی کہ جس تند ہوا سے وہ ہلاک کیے گئے اس کے ساتھ سرما

کے وہ بادل بھی تھے جو ہمیشہ رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوا کرتے ہیں۔ قرآن میں جہاں ان کی تباہی کا ذکر ہوا ہے، ہوا کے ساتھ پانی سے خالی بادلوں اور صاعقہ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ سورۂ احقاف میں ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا (الاحقاف: ۲۴-۲۵)

جب انھوں نے عذاب کو ابر کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا، بولے یہ تو بادل ہے جو ہمیں سیراب کرنے والا ہے۔ بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچاتے ہوئے تھے۔ یعنی بادِ تند جس کے اندر ایک دردناک عذاب ہے۔ اکھاڑ پھینکے گی ہر چیز اپنے رب کے حکم سے۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام خصوصیات موسم سرما کی ہوا اور اس کے بادلوں کی ہیں۔ اس زمانے میں بادِ شمال صرصر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ خشکی اور قحط کی ایک عام نحوست اور تباہی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ سورۂ قمر میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے: اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ؕ (۱۹) (اور ہم نے ان پر بادِ صرصر چلا دی قائم رہنے والی نحوست کے زمانہ میں) اسی طرح حٰمٓ السجدۃ میں ہے: فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (۱۶) (پس ہم نے ان پر بادِ صرصر چلا دی نحوست کے زمانے میں)"۔

اس کے بعد مولاناؒ نے اپنے دعوے کی تائید میں بعض شعرائے جاہلیت کے حوالے پیش کیے ہیں پھر آگے فرماتے ہیں۔

"سرما کی یہ تند ہوائیں جب چلتی ہیں تو دھاریوں والے سرخ بادلوں کے ٹکڑے، اولے اور رعد و برق کی آفتیں اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ کلامِ عرب میں اس کی تمام تفصیلات ملتی ہیں......"

"حٰمٓ السجدۃ میں قومِ عاد کے عذاب کے ذیل میں صاعقہ یعنی کڑک اور چمک کی بھی تصریح ہے: فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۱۳) (اگر وہ اعراض کریں تو ان کو باخبر کر دو کہ میں تم کو اس طرح کی کڑک کے عذاب سے ڈراتا ہوں، جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہوا)"۔

"اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے بادل، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب نازل فرمایا لیکن اصل تباہی ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی اس وجہ سے اگر اثر سے مؤثر پر استدلال کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہرا کر دینے والی چیخ بھی تھی جس طرح قوم

عاد پر ہوا کے ساتھ رعد و برق والے بادل بھیجے۔ چونکہ ثمود کی تباہی صاعقہ ہی کے ذریعے سے واقع ہوئی .... اس وجہ سے صرف اسی کا ذکر کیا، بادلوں کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن التزامی طور پر ثبوت ان کا بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عاد کے ذکر میں ہوا کا ذکر بار بار کیا ہے لیکن بادلوں کا ذکر صرف ایک ہی جگہ کیا ہے۔[1]"

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ (۴۶)

قوم نوح کے عذاب کی طرف اشارہ

یہ عطف اس مفہوم پر ہے جو اوپر کی سرگزشتوں سے متبادر ہوتا ہے یعنی جس طرح ہم نے قوموں کو پکڑا یا ہلاک کیا اسی طرح ان سے پہلے قوم نوح کو بھی ہلاک کیا۔ مفہوم و معنی پر عطف کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔ اس کے شواہد پیچھے گزر چکے ہیں۔

یہ آخر میں قوم نوح کے واقعہ کی طرف بھی اجمالی اشارہ کر دیا۔ اگرچہ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے سب سے پہلے اسی واقعہ کا ذکر ہونا تھا لیکن قرآن نے یہاں ترتیب تاریخی اختیار نہیں کی بلکہ قریش کو ان واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی روایات اور جن کے آثار ان کے ملک میں موجود تھے اور جن کی طرف اوپر آیت 'وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ' میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہ مقصد متقضی ہوا کہ پہلے قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ کا ذکر آئے جو زمانی و مکانی دونوں ہی اعتبار سے نسبتہً قریب کے واقعات تھے اس وجہ سے مخاطب پر زیادہ اثر انداز ہو سکتے تھے۔ پھر سب سے آخر میں سب سے پہلے واقعہ کا بھی حوالہ دے دیا تاکہ مخاطب کے سامنے پوری تاریخ آجائے۔

اس واقعہ کی یاد دہانی کا یہ خاص پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ جس طرح مذکورہ بالا قوموں کی سرگزشتوں میں آپ نے دیکھا کہ ان کی تباہی میں اصلی عامل کی حیثیت ہوا کے تصرفات کو حاصل ہے جس کی قسم سورہ کے شروع میں کھائی گئی ہے، اسی طرح قوم نوح کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہوا ہی کے تصرف سے ہلاک کیا۔ استاذ امام فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں قوم نوح کی تباہی کی نوعیت پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کا ضروری حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

"قرآن اور تورات میں قوم نوح کی تباہی سے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی تباہی میں بھی اصلی دخل ہوا کے تصرفات ہی کا رہا ہے۔

سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہے۔

قوم نوح کی تباہی میں اصلی دخل ہوا کے تصرفات کا تھا

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا	اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال

---

[1] تفسیر سورۂ ذاریات فراہیؒ

خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (العنکبوت: ۱۴)

رہا۔ پس ان کو پکڑا طوفان نے اور وہ ظالم تھے۔"

"اس آیت میں لفظ 'طوفان' خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ 'طوفان' کے لغوی معنی دوران یعنی گردش کرنے اور چکر کھانے کے ہیں۔ اہلِ عرب اس سے اس تند ہوا کو مراد لیتے ہیں جو تیزی سے چکر کھاتی ہوئی اٹھتی ہے۔"

اس معنی کی تائید میں کلامِ عرب کے بعض شواہد نقل کرنے کے بعد مولاناؒ فرماتے ہیں:

"دوسری زبانوں میں بھی اس قسم کی تند ہوا کے لیے اس کے ہم معنی اور اسی کے مشابہ الفاظ ہیں۔ فارسی میں اس کو گرد باد کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے سائیکلون (CYCLONE) کا لفظ ہے۔ مصریوں کے ہاں ہوا کا ایک خاص دیوتا تھا جس کو ٹائفون[1] کہتے تھے۔ اس ہوا کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے شدت کی بارش ہوتی ہے اور سمندر کا پانی جوش میں آجاتا ہے۔ میں نے کراچی میں اس قسم کا طوفان بچشمِ خود دیکھا ہے۔ بحرِ ہند کے مشرق سے ایک طوفان اٹھا اور مغرب کی طرف گزر گیا۔ اس کے اثر سے نہایت سخت بارش ہوئی۔ جہاز پہاڑوں سے جا ٹکرائے۔ دوسرے جانی و مالی نقصانات بھی بے شمار ہوئے۔ طوفانِ نوح کے جو حالات تورات و قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ بڑی حد تک اس سے مشابہ ہیں۔ سورۂ قمر میں ہے:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓي اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (القمر: ۱۲)

ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے ساتھ کھول دیے اور زمین کے تمام چشمے پھوٹ نکلے۔ پس پانی ٹھہرائے ہوئے اندازہ تک پہنچ گیا۔"

"تورات کی کتاب پیدائش: باب - ۱۱ میں ہے۔

'بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔'"

"سورۂ ہود میں ہے:

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ (ھود: ۴۲)

اور وہ کشتی ان کو لے کر ایسی موجوں کے اندر چل رہی تھی جو پہاڑوں کی طرح بلند ہو رہی تھیں۔"

"پہاڑ کی طرح موجوں کا اٹھنا اسی حالت میں ہوتا ہے جب تند ہوا چل رہی ہو۔"

آخر میں مولاناؒ نے خلاصۂ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

---

[1] انگریزی میں (TYPHOON) سمندر کے سائیکلونی طوفانوں کے لیے ایک معروف لفظ ہے۔ (اصلاحی)

" اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قومِ نوح پر تُند اور جکڑ دار ہوا کا طوفان آیا جس سے سخت بارش ہوئی۔ پاس کے سمندروں کا پانی اُبل پڑا اور ہر طرف سے موجیں اٹھنے لگیں۔ اس طوفان کے اندر نوح علیہ السلام کا سفینہ کوہ جودی پر جا کے ٹکا۔"

۹۔ واقعات کی ترتیب پر ایک نظر

اوپر جو واقعات بیان ہوئے ہیں آیات کی وضاحت کے ضمن میں ہم ان کی حکمت کی طرف ضروری اشارات کرتے آئے ہیں لیکن استاذ امامؒ نے ان کی ترتیب پر ایک پوری فصل لکھی ہے جس میں نہایت لطیف نکتے بیان فرمائے ہیں۔ اس فصل کا ضروری حصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں:-

" حضرت ابراہیم و حضرت لوط علیہما السلام کی جو سرگزشت یہاں بیان ہوئی ہے اس کا ایک پہلو تو بالکل واضح ہے کہ اس میں بشارت اور انذار دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بعینہٖ یہی حال ہوا کا بھی ہے جس کی یہاں قسم کھائی گئی ہے۔ وہ بھی کبھی پیام رحمت بن کر ظاہر ہوتی ہے اور کبھی صورتِ عذاب بن کر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی یہ جامع حیثیت مقتضی ہوئی کہ یہاں وہی تمہید کی جگہ پائے۔"

" اس کے بعد قوم لوط کی سرگزشت بیان ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں کو ان کی تباہ شدہ بستیوں پر سے گزرنے اور ان کے آثار و نشانات اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں مقسم بہ کے پہلے ٹکڑے 'وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا o فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا' (قسم ہے ان ہواؤں کی جو غبار اڑاتی چلتی ہیں پھر اٹھا لیتی ہیں بوجھ) سے سب سے زیادہ قریبی مناسبت قوم لوط کی تباہی کے واقعہ ہی کو تھی۔ ان کی تباہی تند ہوا سے ہوئی تھی جس نے ریت اور سنگ ریزوں سے ان کو ڈھانپ دیا۔ اس کی اتنی مقدار ان کے اوپر لا ڈالی کہ اس کے نیچے ان کی بستیاں بھی چھپ گئیں۔"

" علاوہ بریں اوپر جو فرمایا ہے: 'وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ' (اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں) تو قوم لوط کی سرگزشت میں اس دعوے کا بھی نہایت واضح ثبوت موجود تھا جس کی وضاحت پیچھے ہو چکی ہے۔"

" اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت ہے۔ یہ سرگزشت قرآن مجید میں بار بار بیان ہوئی ہے اور اس کے اندر نہایت اعلیٰ سبق ہیں۔ اس کو مُقسم بہ کے دوسرے ٹکڑے 'فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا o فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا' (پھر بوجھ اٹھا لینے والی، پھر آہستہ چلنے والی) سے نہایت واضح مناسبت ہے۔ اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔"

"یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جن سرگزشتوں کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ناموں نے شروع کیا ہے ان کے اندر بشارت کا پہلو نمایاں ہے۔ اس کے بعد جو سرگزشتیں قوموں کے نام سے سنائی گئی ہیں ان کے اندر انذار کا پہلو غالب ہے۔ قوموں میں سے عاد اور ثمود کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اوپر جو عذاب آیا وہ دھاریوں والے بادلوں (وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ) کی شکل میں آیا۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ جو ترتیب قسموں میں ملحوظ ہے وہی ترتیب قوموں کے ذکر میں بھی ہے۔ عاد اور ثمود کے ذکر میں عاد کو مقدم رکھا ہے اس کی وجہ تقدم زمانی کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ان پر جو عذاب آیا وہ ہوا اور بادل دونوں کے تصرفات کا نتیجہ تھا۔"

"رہی نوح علیہ السلام کی سرگزشت تو وہ تمام قوموں اور امتوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ایک غیر فانی نشانی ہے۔ یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِى الْجَارِيَةِ ۙ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (الحاقۃ: ۱۱-۱۲)	جب پانی حد سے بڑھ گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں اٹھا لیا تاکہ اس سرگزشت کو تمہارے لیے یاددہانی بنائیں اور محفوظ رکھنے والے کان اس کو محفوظ کرلیں۔

"اس سرگزشت کے اندر زمین، آسمان، ابر، ہوا، بادل، کشتی اور پانی سب کے کرشمے جمع ہو گئے ہیں۔ اس جامعیت کے سبب سے اس نے آفاقی و انفسی دلائل کے ایک مجموعہ کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ چنانچہ اوپر ہوا کی جو شہادتیں بیان ہوئیں اور بعد میں زمین و آسمان اور نفس کے جن آثار و دلائل کی طرف اشارے کیے گئے ان سب کے لحاظ سے مناسب ہوا کہ قومِ نوح کی یہ جامع سرگزشت سنا کر وہ ساری حقیقتیں ممثل کر کے نگاہوں کے سامنے رکھ دی جائیں۔"

"نیز عاد اور ثمود کو زمین کی خلافت قومِ نوح کے بعد ہی ملی تھی اس وجہ سے بھی مناسب ہوا کہ ان کے ذکر کے ساتھ قوم نوح کا بھی حوالہ دیا جائے۔ قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال بھی موجود ہے۔

وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ِۨ الْاُوْلٰى ۙ وَثَمُوْدَا۟ فَمَآ اَبْقٰى ۙ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ۭ (النجم: ۵۰-۵۲)	اور اس نے عاد اول کو ہلاک کیا اور ثمود کو بھی۔ پس ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ اور اس سے پہلے قومِ نوح کو بھی ہلاک کیا۔ یہی لوگ ظالم و سرکش تھے۔"

"اس آیت میں وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ کے ٹکڑے پر خاص طور پر نگاہ رکھیے۔"

"چونکہ یہ سرگزشت مشہور اور قدیم ہونے کے علاوہ تمام قوموں کی مشترک سرگزشت ہے اس وجہ سے اول تو اس کی طرف اجمالی اشارہ کافی ہوا پھر اس کا ذکر ایک اتمامی سرگزشت کی حیثیت سے کیا گیا۔ نیز ایجاز کی خوبی دیکھیے کہ محض اسلوب کی تبدیلی سے ظاہر ہو گیا کہ ماقبل سے اس کو کسی قدر مستقل اور جداگانہ اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ 'وَفِیْ نُوْحٍ' نہیں کہا، جیسا کہ اوپر 'وَفِیْ مُوْسٰی' اور 'وَفِیْ عَادٍ' کہا ہے بلکہ اسلوب بدل کر 'وَقَوْمَ نُوْحٍ' فرمایا تاکہ بدلا ہوا اسلوب خود متنبہ کر دے کہ اس سرگزشت کی اہمیت کچھ اور ہے۔"

۱۰۔ آگے آیات ۴۷ ۔۔ ۶۰ کا مضمون

آگے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و ربوبیت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قیامت اور جزاء و سزا سے ڈرایا ہے اور اسی ضمن میں توحید کی بھی یاد دہانی فرمائی ہے تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ سب کو ایک ہی خدا سے سابقہ پیش آنا ہے، کوئی دوسرا خدا کی پکڑ سے بچانے والا نہیں بنے گا۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ جو سلوک تمہاری قوم تمہارے ساتھ کر رہی ہے یہی سلوک ہر قوم نے اپنے رسول کے ساتھ کیا ہے تو تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ شریروں سے اعراض کرو۔ بس ان کو بات سناؤ جو سنتے ہیں۔ اللہ ہر قدم پر تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی مدد فرمائے گا۔ تم اللہ کے سوا کسی کی مدد کے محتاج نہیں ہو۔ جو عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں ان کو آگاہ کر دو کہ جلدی نہ مچائیں۔ ان کے لیے جو فرصت مقدر ہے جب وہ پوری ہو جائے گی تو عذاب آ جائے گا اور وہ بڑی سخت چیز ہوگا۔

آیات ۴۷ — ۶۰

وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۰﴾ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۱﴾ كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ

طَاغُوْنَ ﴿٥٣﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿٥٤﴾ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ
الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٥﴾ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا
لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ
يُّطْعِمُوْنِ ﴿٥٧﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿٥٨﴾
فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا
يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿٥٩﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ
يُوْعَدُوْنَ ﴿٦٠﴾

ع ٣ / ١٤ / ٢

ترجمہ آیات ۴۷-۶۰

اور آسمان کو ہم نے بنایا قدرت کے ساتھ اور ہم بڑی ہی وسعت رکھنے
والے ہیں اور زمین کو ہم نے بچھایا، پس کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں!
اور ہر چیز سے ہم نے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ پس اللہ کی
طرف بھاگو، میں اس کی طرف سے تمھارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں
اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ بناؤ۔ میں اس کی جانب سے
تمھارے لیے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۴۷-۵۱

ایسے ہی ان کے اگلوں کے پاس جو رسول بھی آیا اس کو انھوں نے جادوگر یا دیوانہ
ٹھہرایا۔ کیا انھوں نے آپس میں ایک دوسرے کو اس کی وصیت کر چھوڑی
ہے! یہ ہیں ہی سرکش لوگ! پس ان سے تم اعراض کرو، اب تم پر کوئی الزام
نہیں۔ اور یاددہانی کرتے رہو کیونکہ یاددہانی ایمان والوں کو نفع پہنچاتی
ہے۔ ۵۲-۵۵

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ نہ میں ان سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ رزق کا سامان کریں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بلاشبہ اللہ ہی روزی رساں، زور آور، قوت والا ہے۔ ۵۶-۵۸

پس ان ظالموں کے لیے بھی ویسا ہی مقرر پیمانہ ہے جیسا ان کے اگلے ہم مشربوں کے لیے تھا۔ تو جلدی نہ مچائیں۔ ان کافروں کے لیے ان کے اس دن کے سبب سے بڑی خرابی ہے جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔ ۵۹-۶۰

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۴۷)

قدرت کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ

'اَیْد' کے معروف معنی تو ہاتھ کے ہیں لیکن یہ قوت و قدرت کی تعبیر کے لیے بھی آتا ہے۔ تنکیر یہاں تفخیم شان کے لیے ہے۔ 'مُوْسِعُوْنَ' یعنی اس کا اقتدار و اختیار بہت وسیع ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا کام بھی اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے۔

اوپر جزا و سزا کے اثبات کے لیے جو تاریخی دلیلیں بیان ہوئی ہیں انہی پر عطف کر کے یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس قدرت و عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص اپنے سر پر پھیلے ہوئے آسمان اور اس کے عجائب کے اندر کر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا جو خدا اس عظیم اور ناپیدا کنار آسمان کو وجود میں لا سکتا ہے اس کے لیے انسان کو اس کے مر کھپ جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا مشکل ہو جائے گا! یہی مضمون دوسرے مقامات میں یوں بیان ہوا ہے 'ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا' (النّٰزعٰت ۷۹: ۲۷) (کیا تمہارا پیدا کیا جانا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا؟ اس کو بنایا......)۔

'وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ' یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ اس عظیم آسمان کو پیدا کرنے میں ساری قوت نچڑ گئی ہے، اب کوئی اور کام ہم نہیں کر سکتے۔ ہمارے اندر بڑی سمائی اور بڑی قدرت ہے۔ ہم جو چاہیں اور جب چاہیں کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز بھی ہمارے حیطۂ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ بعض دوسرے مقامات میں یہی مضمون یوں بھی بیان ہوا ہے کہ ہم نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔

وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (قٓ : ۳۸) اور ہم کو ذرا بھی تکان لاحق نہیں ہوئی۔

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ (۴۸)

آسمان کے بعد زمین کی طرف اشارہ

آسمان کے بعد زمین کی طرف توجہ دلائی کہ اس کو دیکھو ہم نے کس خوبی سے بچھایا ہے اور ہم کتنے اچھے بچھانے والے ہیں! یعنی زمین پر غور کرو تو اس سے ہماری قوت و عظمت بھی واضح ہو گی اور ہماری ربوبیت بھی۔ جس سے ہر معقول آدمی اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ جس خدا نے یہ زمین بنائی ہے اور اس کے اندر انسان کی پرورش کے لیے گوناگوں وسائل پیدا کیے ہیں اس نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا ہے۔ یہ بات اس کی حکمت و ربوبیت کے منافی ہے کہ وہ کوئی عبث کام کرے۔ حکمت و ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ہر شخص اس دنیا کی زندگی سے متعلق مسئول ہو کہ اس نے اس میں خالق کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کی یا اپنی مرضی چلائی، اگر اس نے خالق کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کی ہو تو وہ حقدار ہے کہ اپنی اس شکرگزاری کا صلہ پائے اور اگر اپنی من مانی کی ہو تو وہ سزاوار ہے کہ اپنی اس سرکشی کی سزا بھگتے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہو چکا ہے۔ یہاں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ سورۂ نبا کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

'فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ' سے مقصود اس دنیا کے ان عجائباتِ حکمت و ربوبیت کی طرف اشارہ کرنا ہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا خالق صرف ایک بے پناہ قدرت رکھنے والا ہی نہیں ہے بلکہ جس طرح اس کی قدرت بے پناہ ہے اسی طرح اس کی حکمت، رحمت، پروردگاری اور اس کے جود و کرم کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ پھر یہیں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی یہ صفات بھی متقاضی ہیں کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں وہ اپنے بندوں کے درمیان انصاف کرے اور اس کے کامل عدل اور اس کی کامل رحمت کا ظہور ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی صفاتِ رحمت و ربوبیت کی نفی ہو جاتی ہے حالانکہ اس دنیا کا ہر گوشہ اس کی شہادت سے معمور ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۴۹)

اس کائنات کا ایک خاص پہلو

یہ اس کائنات کے ایک اور خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی اور یہ پہلو بھی اپنے اندر قیامت اور جزا و سزا کی دلیل رکھتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے۔ چنانچہ اوپر آسمان و زمین کا ذکر ہو چکا ہے۔ ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر ہی اپنی غایت اور اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے اس سے ایک طرف تو توحید کی دلیل ملتی ہے کہ ایک مدبر و حکیم ہستی نے یہ دنیا پیدا کی ہے جو اس تمام کائنات سے بالاتر اور سب پر حاوی ہے اور اپنی قدرت و

حکمت کے تحت، اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط پیدا کر کے ان کو صالح نتائج کے ظہور کا ذریعہ بناتی ہے۔
دوسری طرف یہ آخرت کی بھی ایک بدیہی دلیل ہے اس لیے کہ اس دنیا کی ہر چیز جب جوڑا جوڑا ہے اور ہر چیز اپنی غایت کو اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر پہنچتی ہے تو ضروری ہے کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ہو تاکہ اس میں جو خلا نظر آتا ہے اس جوڑے کے ساتھ مل کر بھر جائے۔ یہ جوڑا آخرت ہے۔ آخرت کو مان لینے کے بعد یہ دنیا ایک بامقصد و باحکمت چیز بن جاتی ہے اور آخرت کو نہ مانیے تو ایک بالکل باطل و عبث چیز ہو کے رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے آخرت کو نہ ماننے والوں سے جگہ جگہ یہ سوال کیا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے! اس دلیل کی پوری وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا جوڑے جوڑے ہونا اس امر کی یاددہانی کرتا ہے کہ اس دنیا کا بھی جوڑا ہے جس سے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور وہ ہے آخرت!

فَفِرُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ (۵۰)

آخرت کی یاددہانی

یعنی جب آخرت ہے اور اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی مخالفت سے باز آؤ، اپنے رب کی طرف بھاگو اور اس دن کے لیے تیاری کرو جس دن ہر شخص سے اس کے اعمال کی بابت پرسش ہوتی ہے اور جس دن خدا کے سوا کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔

اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے ایک 'نَذِیۡرٌ مبین' کی حیثیت سے آیا ہوں کہ آخرت کے ظہور سے پہلے پہلے اس کے خطرات سے تمہیں اچھی طرح آگاہ کر دوں تاکہ کسی کے لیے اس دن عذر کی گنجائش باقی نہ رہے کہ اس کے پاس کوئی اس دن سے آگاہ کرنے والا نہیں آیا۔ میں نے ایک 'نذیر مبین' کی طرح تمہیں اس دن کے احوال اور اس کی ہولناکیوں سے اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے۔ اب نتائج کی ساری ذمہ داری خود تمہارے اوپر ہے۔

'نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ' کے اندر جو تلمیح ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ 'مِنۡہُ' سے مراد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تمہارے انذار ہی کے مشن پر مامور ہو کر آیا ہوں۔ بعض لوگوں نے 'مِنۡہُ' کو 'نَذِیۡرٌ' کے صلہ کے مفہوم میں لیا ہے، لیکن یہ رائے عربیت کے بھی خلاف ہے اور نظائر قرآن کے بھی۔

وَلَا تَجۡعَلُوۡا مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ (۵۱)

اس حقیقت کی یاددہانی کہ خدا کا کوئی شریک نہیں

یہ اوپر کے مضمون کی تکرار نہیں ہے بلکہ ایک اور حقیقت سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ جب آخرت کا مرحلہ آئے گا تو اس دن تمہارے مزعومہ شرکاء و شفعاء تمہاری مدد کریں گے یا سفارش کر کے خدا کی پکڑ سے تمھیں بچا لیں گے۔ اس قسم کے خیالی سہاروں پر بھروسہ کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ اس دن سابقہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک سے پیش آئے گا، دوسرے سہارے سب بے حقیقت ثابت ہوں گے۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مشن پر بھی مامور ہوں کہ تمھیں اس حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دوں کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ مشرکین اول تو قیامت کو بہت بعید از امکان خیال کرتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجے میں مانتے بھی تھے تو ان کو گمان یہ تھا کہ ان کا معاملہ تو ان کے شرکاء کے سامنے پیش ہوگا، وہ اپنے زور و اثر سے ان کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ ان کے اس زعم نے قیامت کو ان کے نزدیک ایک بالکل بے اثر چیز بنا دیا تھا۔ ان کی اسی غلط فہمی پر ضرب لگانے کے لیے قرآن میں قیامت کے ساتھ توحید کا ذکر ضرور آتا ہے۔ پیچھے اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اسی نوعیت کی تنبیہ یہاں بھی ہے۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۵۲)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان لوگوں کی اس روش پر غم نہ کرو۔ اس صورتِ حال سے تمھی کو سابقہ پیش نہیں آیا ہے بلکہ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں انھوں نے اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔

رسولوں کے ساتھ شریروں کی روش

'قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ'۔ یعنی انھوں نے جب ان کی طلب پر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دکھائیں تو ان کو جادوگر ٹھہرایا اور جب ان کو عذاب و قیامت سے ڈرایا تو ان کو خبطی اور دیوانہ قرار دیا۔ 'ساحر' اور 'مجنون' کے الفاظ بطور مثال نقل ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی مخالفت کے لیے انھوں نے کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کر ہی لیا۔ اسی طرح تمہاری قوم کے اشرار بھی تمہیں مطعون کرنے کے لیے طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ رسولوں کے ساتھ اشرار کا سلوک ہمیشہ یہی رہا ہے۔ اس میں تمہاری کسی کوتاہی یا غلطی کو کوئی دخل نہیں ہے اور نہ یہ صورتِ حال صرف تمھی کو پیش آئی ہے۔ اس وجہ سے دل گرفتہ نہ ہو بلکہ صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرو جس طرح تم سے پہلے اولوالعزم رسولوں نے کیا۔

اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۵۳)

یہ اشرار کی روش کی یکسانی اور اس کے تسلسل پر اظہارِ تعجب ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کے اشرار نے اپنے بعد آنے والی قوم کے اشرار کو یہ وصیت کر چھوڑی ہے کہ تمہارے پاس بھی کوئی رسول آئے تو اس سے وہی سلوک کرنا جو ہم نے اپنے رسول سے کیا ہے۔ چنانچہ ہر آنے والی نسل اپنے اسلاف

کی اس وصیت کو پوری وفاداری کے ساتھ تعمیل کرتی چلی جا رہی ہے۔

بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ: یہ اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ عمل کی اس مشابہت کی اصل علت یہ ہے کہ یہ لوگ بھی (یعنی قریش) اسی طرح کے سرکش ہیں جس طرح کے سرکش پچھلے رسولوں کے مکذبین تھے۔ مزاج کی یہ یکسانی اس بات کا سبب ہوئی کہ یہ بھی وہی ٹیڑھی چال چلیں جو ان کے پیش رو چلے اور پھر لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں جس سے وہ دوچار ہوئے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (۵۴)

مغروروں سے اعراض اور نیکوں کی طرف التفات کی ہدایت

یعنی اس قسم کے شریر لوگوں سے، جو مخالفت کے لیے ادھار کھائے بیٹھے ہوں، تم اعراض کرو۔ رسول کی حیثیت سے انذار و تبلیغ کی جو ذمہ داری تھی وہ تم نے ادا کر دی۔ اب تم عند اللہ بری ہو۔ اب کوئی پرسش ان کے باب میں تم سے نہیں ہونی ہے بلکہ یہ خود سزاوار ملامت ہیں اور اس کا انجام عنقریب دیکھیں گے۔

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۵)

یعنی شریروں اور سرکشوں سے تو اعراض کرو لیکن ان لوگوں کو سمجھاتے رہو جو تمھاری بات سنتے ہیں۔ ایمان کے طالبوں کو تمھاری تعلیم و تذکیر سے نفع پہنچتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اوپر کی آیت میں اعراض کی جو ہدایت ہے اس کا تعلق قریش کے ان سرکش لیڈروں سے ہے جو غرور کے سبب سے کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے ان کے ایمان کے لیے زیادہ فکر مند تھے کہ یہ ایمان لائیں گے تو اس سے دین کو تقویت حاصل ہوگی اور دوسروں کے لیے ایمان کی راہ کھلے گی۔ یہ مصلحت بجائے خود ایک اہم مصلحت تھی اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مدت تک ان کے پیچھے سرگرداں رہے لیکن جب ان پر حجت تمام ہو گئی اور واضح ہو گیا کہ یہ پتھر اپنی جگہ سے کھسکنے والے نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۶-۵۸)

دو اہم حقیقتوں کا بیان

قریش کے لیڈروں سے اعراض کے حکم کے بعد ان آیات میں دو نہایت اہم حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اول اس حقیقت کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو جو پیدا کیا ہے تو اپنی کسی احتیاج کے لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ ہر حال میں ان کی ناز برداری کرتا رہے۔ اس کی سلطنت اپنے بل بوتے پر قائم ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ لوگ ہی اس کے محتاج ہیں۔ اس نے ان کو اس لیے پیدا کیا کہ اس کی عبادت و اطاعت کا حق ادا کر کے سعادت و کمال کے مدارج حاصل کریں جو اس نے ان

کے لیے مقدر کر رکھے ہیں۔ اسی مقصد کی یاددہانی کے لیے اس نے اپنے رسول بھیجے تاکہ لوگوں پر اصل حقیقت واضح ہو جائے۔ لیکن رسول کی ذمہ داری صرف حق کو واضح کر دینے کی ہے۔ یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ لوگ اس حق کو لازماً قبول بھی کر لیں۔ رسول نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اگر لوگ اس کی دعوت کو قبول نہیں کر رہے ہیں تو اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں۔ خدا اور اس کے رسول کا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں کہ ان کو ہر قیمت پر کسی نہ کسی طرح راضی کرنے ہی کی کوشش کی جائے۔

گویا اوپر والی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لیڈروں سے اعراض کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے ان آیات میں اس کی وجہ بیان فرما دی گئی ہے کہ ان متکبرین کے بغیر خدا کا کوئی کام بند نہیں ہو جائے گا کہ تم ان کے پیچھے اپنے کو ہلکان رکھو۔

دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ اللہ کے دین کی دعوت اپنا زاد و راحلہ اپنے ساتھ رکھتی ہے جو لوگ اس دعوت کو لے کر اٹھیں ان کا سارا بھروسہ اپنے رب پر ہونا چاہیے۔ انھیں یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی عبادت و اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہی چیز ان کی خلقت کی غایت اور ان کی زندگی کا نصب العین ہے جس کا پورا ہونا ہر شکل میں مطلوب ہے۔ اس کی خاطر تو وہ ہر چیز قربان کر سکتے ہیں لیکن اس کو کسی چیز پر بھی قربان نہیں کر سکتے۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ اس جرم میں ان کے دشمن ان پر تمام معاشی راہیں مسدود کر دیں گے جب بھی انھیں اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہنا اور یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ اگر انھوں نے اپنے مقصدِ حیات سے انحراف اختیار نہ کیا تو اللہ تعالیٰ دشمنوں کے علی الرغم ان کے لیے رزق کی ایسی راہیں کھولے گا جن کا گمان نہ ان کو ہوگا اور نہ ان کے دشمنوں کو۔ رزاق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ بڑی ہی محکم قوت و تدبیر کا مالک ہے۔ کسی بڑے سے بڑے دشمن کی قوت بھی اس کی قوت پر غالب نہیں آ سکتی۔

یہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو، دعوت کے اس دور میں جب کفار ان کو مکہ سے نکال دینے اور تمام معاشی راہیں ان پر بند کر دینے کی اسکیمیں سوچ رہے تھے، تسلی دی گئی ہے کہ تم اللہ واحد کی بندگی کے اس نصب العین پر ڈٹے رہو جس کے لیے تمہارے رب نے تم کو پیدا کیا ہے۔ رزاقِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ تمہارے لیے غیب سے رزق کی راہیں کھولے گا۔ بندوں کا فرض اپنے رب کی بندگی کرنا ہے۔ رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کے پورا کرنے میں کسی پہلو سے بھی عاجز نہیں ہے۔ یہ مضمون قرآن میں ان مواقع میں خاص طور پر بیان ہوا ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے اغنیاء سے بے نیاز ہو کر اپنے موقفِ حق پر ثابت قدم رہنے کی ہدایت فرمائی گئی۔ بعض آیتیں ہم بطور مثال نقل کرتے ہیں۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ   اور تم اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو

عَلَيۡهَا ؕ لَا نَسۡـَٔلُكَ رِزۡقًا ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكَ ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰى (طٰهٰ : ۱۳۲) — ہم تم سے رزق رسانی کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم ہی تم کو روزی دیں گے اور انجام کار کی کامیابی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔

یہی مضمون، دوسرے الفاظ میں یوں آیا ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ اِلٰى مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ (الحجر - ۸۸) — اور ہم نے ان کفار کی بعض جماعتوں کو جن چیزوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے اس کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ اور نہ ان کے حال پر غم کرو اور اپنی شفقت کے بازو اہل ایمان پر جھکائے رکھو۔

کلام کا موقع و محل سمجھ لینے کے بعد ایک نظر اس کے اجزا پر بھی ڈال لیجیے۔

"وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ"۔ اس آیت میں لفظ 'عبادت' اپنے وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی رب کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت۔ مقصود اس حقیقت کا پتہ بتا دینے سے زندگی کے اصل نصب العین کو سامنے رکھ دینا ہے تاکہ ہر انسان واضح طور پر جان لے کہ اسے کس مقصد کے لیے جینا اور کس مقصد کے لیے مرنا ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ خدا کی بندگی اس لیے مطلوب نہیں ہے کہ خدا کسی کی بندگی کا محتاج ہے بلکہ قرآن میں جابجا یہ تصریح ہے کہ بندے ہی اس کی بندگی کے محتاج ہیں اس لیے کہ ان کی رفعت و بلندی کا زینہ یہ بندگی ہی ہے۔ اگر اس بندگی سے وہ منحرف ہو جائیں تو پھر ان کی حیثیت حیوانات سے زیادہ نہیں رہ جاتی بلکہ وہ ان سے بھی فروتر درجے میں گر جاتے ہیں۔ یہاں جنوں اور انسانوں دونوں کا ذکر ایک درجہ کی مخلوق کی حیثیت سے کیا ہے، اس لیے کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے اختیار کے شرف سے مشرف فرمایا ہے اور دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں مساوی درجے میں مسئول اور بندگیٔ رب کا حق ادا کرنے کی صورت میں یکساں اجر و شرف کے حق دار ہیں۔

"مَاۤ اُرِيۡدُ مِنۡهُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ وَّمَاۤ اُرِيۡدُ اَنۡ يُّطۡعِمُوۡنِ"۔ یہ اس امر کی وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اپنی کسی ضرورت کے لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ ان کے بغیر اس کا کوئی کام بند ہو جائے۔ اس نے نہ تو اپنی مخلوق کی رزق رسانی کی ذمہ داری ان پر ڈالی ہے اور نہ وہ خود کھانے پینے کا محتاج ہے کہ ان سے یہ چاہے کہ وہ اس کو کھلائیں بلکہ وہ خود ہی سب کا روزی رساں ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ انسان خود اپنے یا اپنی آل و اولاد کے رزق کے لیے اس دنیا میں جو جدوجہد کرتا ہے اس میں اس کی حیثیت ایک آلہ اور ذریعہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس کی کوششوں کو بار آور کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اگر اس کا فضل نہ ہو تو آدمی کی ساری محنت اکارت ہو کے رہ جائے۔ چنانچہ فرمایا: اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ (الواقعہ: ۶۳-۶۴)

(غور تو کرو اس چیز پر جو تم بوتے ہو! کیا تم اس کو پروان چڑھاتے ہو یا ہم اس کو پروان چڑھانے والے ہیں!)

'وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ' میں مشرک قوموں کے اس وہم پر بھی ایک ضرب ہے جو وہ اپنے دیوتاؤں کی نسبت رکھتی ہیں کہ وہ ان کی پیش کردہ قربانیوں سے بہرہ مند اور محظوظ ہوتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۔ یعنی حالات کی ظاہری ناساعدت سے بددل ہو کر کوئی خدا کی رزق رسانی و کارسازی کے باب میں کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔ رزاق حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ بڑی ہی محکم قوت کا مالک ہے۔ حالات کی ناساعدت اور مخالفوں کی مزاحمت اس کی تدبیروں کو شکست نہیں دے سکتی۔

'ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ' کی وضاحت مولانا فراہیؒ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں فرمائی ہے۔

"لفظ 'متین' پر چونکہ وقف ہے اس وجہ سے اس کا اعراب ظاہر نہیں ہوتا اور جب اعراب ظاہر نہیں ہوتا تو اس کی قراءت میں کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اعراب ہے کیا؟ بعض اس کو مجرور سمجھتے اور اس کو 'قوۃ' کی صفت قرار دیتے ہیں۔ 'قوت' دراصل رسی کی لڑ کو کہتے ہیں اور رسی کی مضبوطی کے لیے عربی میں لفظ 'متین' معروف ہے۔ ایک شبہ یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ لفظ 'قوت' مؤنث ہے اور 'متین' مذکر ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ 'متین' فعیل کے وزن پر ہے اور یہ وزن عربی میں مذکر اور مؤنث دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ارشاد ہے 'اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ' (الاعراف: ۵۶) (اللہ کی رحمت محسنوں کے قریب ہے)۔

"بعض اس کو حالتِ رفع میں سمجھتے اور اس کو 'ذو القوۃ' کی صفت قرار دیتے ہیں لیکن لفظ 'متین' اللہ تعالیٰ کی صفت کی حیثیت سے قرآن میں کہیں اور نہیں استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کا فاعل محذوف مانا جائے یعنی 'المتین قوتہ' اس طرح یہ اختلاف محض اعراب کا اختلاف ہوگا، معنی میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوگا۔"

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ (۵۹)

کلمات کی تحقیق

'ذَنُوْب' بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں۔ خالی ڈول کے لیے یہ لفظ نہیں آتا۔ اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ حصہ اور نصیب کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ ابو ذؤیب کا ایک شعر ہے۔

لعمرك والمنايا غالبات   لكل بني اب منها ذنوب

(تیری جان کی قسم، موت سے مفر نہیں۔ ہر باپ کے بیٹوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے)

آیت میں 'ذنوب' سے مراد زندگی کی وہ محدود مدت ہے جو ان کفار کے حصہ میں آئی ہے۔ 'لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' سے مراد قریش کے وہی لیڈر ہیں جن کا رویہ یہاں زیر بحث ہے۔ فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے

ان کے پہلے ہم مشربوں کو (اشارہ عاد و ثمود وغیرہ کی طرف ہے) ایک مدت مہلت کی دی کہ اس کے اندر وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کر کے اپنا پیمانہ بھر لیں اسی طرح ان کو بھی ایک مہلت ہم نے عطا فرمائی ہے کہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ بالآخر یہ مہلت تمام ہونی ہے اور وہ انجام ان کے سامنے آ کے رہے گا جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے تو اس مہلت کو غیر محدود سمجھ کر اس عذاب کے لیے وہ جلدی نہ مچائیں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ مثلاً وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِن دُونِهِ مَوْئِلًا (الکہف: ۵۸) (اور تیرا رب مغفرت اور رحمت کرنے والا ہے، اگر وہ ان کے جرموں پر فوراً مواخذہ کرنے والا ہوتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا۔ لیکن ان کے لیے ایک وعدے کا دن ہے جس سے وہ کہیں پناہ نہیں پائیں گے)۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ (۶۰)

'لِلَّذِينَ كَفَرُوا' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں مراد کفار قریش ہی ہیں جو رسول کے انذار کو محض دھونس خیال کر کے اس کو زچ کرنے کے لیے، مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر اس طرح کا کوئی عذاب آنا ہے تو وہ آ جائے، اس کو دیکھے بغیر ہم اس کو ماننے والے نہیں ہیں۔ فرمایا کہ اس دن کے لیے جلدی نہ مچائیں۔ وہ بڑا ہی کٹھن دن ہوگا۔ اس دن کے سبب سے ان کو جن ابدی ہلاکتوں سے سابقہ پیش آئے گا ان سے ان کو کوئی پناہ نہ دے سکے گا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

رحمان آباد

۱۸ / اپریل ۱۹۷۶ء

۲۸ / ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ